سیر پنجاب

یعنی

وہ روزنامچہ جو عالیجناب معلّٰی القاب ہز ایکسلنسی راجۂ راجایان

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای

پیشکار دولتِ آصفیہ سابق مدار المہام سرکارِ عالی

المتخلص بہ شاد تلمیذ حضرت آصف غفران مکاں نے

زمانۂ سفر پنجاب میں اپنے قلم سے تحریر فرمایا

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

بمطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۳۴۲ ۱۹۲۳

منصور حیدر راجہ

سیر پنجاب

یعنی

وہ روزنامچہ جو عالیجناب مُعلّٰی القاب ہزاکسلنسی راجۂ راجایان
مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای
پیشکار دولتِ آصفیہ سابق مدار المہام سرکارِ عالی
المتخلص بہ شاد تلمیذ حضرتِ آصف غفراں مکاں نے
زمانۂ سفرِ پنجاب میں اپنے قلم سے تحریر فرمایا

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء

كم ه ٩٠١

ش ١١

[illegible]

فہرستِ مضامین سیرِ پنجاب

تمہید

وحدہٗ لاشریک لہٗ

فوائد سفر | تہذیب اور شائستگی کا عمدہ اور اعلیٰ منشا یہ ہی کہ انسان اس طرح اپنی زندگی بسر کرے جس سے اپنی ذات بھی ہمیشہ آرام اور خوشی اور تندرستی کے ساتھ رہی اور دوسروں کو بھی اُس سے فائدہ پہنچے اور ایسے وسیلے بہم پہونچائے جائیں جن سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آنا سہل اور ہر قسم کی خوشی اور راحت حاصل ہونا آسان ہو جائے۔ باقی وہ اُمور جو طرزِ معاشرت اور طریقِ تمدّن سے علاقہ رکھتے ہیں وہ انسان کی بسرِ زندگانی کے ایسے خارجی اسباب ہیں جن پر ایک شائستہ اور مُہذّب آدمی ملک کے مختلف موسموں اور آب و ہوا وغیرہ کے لحاظ سے اِس بات پر غور کر سکتا ہی کہ اِن اُمور میں سے کس امر سے مجھکو آرام ملے گا اور کس سے میں بخوبی تندرست رہ سکتا ہوں۔ کون سی چیز میری خوشی کو بڑھا سکتی ہی اور میرا کون سا کام دوسروں کے لئے مفید ہو سکتا ہی۔

جس آدمی کا خیال شائستہ ہی اُس کے تمام کام خود بخود ایسی عمدہ ترتیب سے انجام پاتے ہیں جس سے وہ تمام خوشیاں اور آرام جو تہذیب و شائستگی کا نتیجہ ہیں حاصل ہوں۔

مگر ہم کیوں کر مُہذّب اور شائستہ ہو سکتے ہیں؟ کیا گھر کی چار دیواری میں ہم کو شائستگی و تہذیب کی بلندی کا زینہ مل سکتا ہی؟ ہرگز نہیں۔ اِس کے لئے ہم کو لازم ہُوا کہ سفر کریں، دُنیا کے عجائبات پر نظر ڈالیں، ہر ملک اور ہر مذہب و مِلّت کے لوگوں کے طرزِ معاشرت اور طریقۂ تمدّن کو دیکھیں۔

ہمارے خیالات اُس وقت تک کبھی عمدہ اور شائستہ نہیں ہو سکتے جب تک دوسروں کے خیالات سے معارضہ نہ کیا جائے۔ جس طرح مال و دولت پھیر بدل سے بڑھتا ہی اسی طرح خیالات کی بھی سفر کی دلچسپیوں سے ترقی ہوتی ہی۔

سفر کے اثرات نہایت وسیع ہیں۔ انسان کے تمام افعالِ ارادی، اخلاق، معاملات، معاشرت، تمدّن، طریقۂ تمدن، صَرفِ اوقات، علوم، تمکن، وقار اور قدر و منزلت، عجائبات قدرت کا نظارہ، ہر ملک کے لوگوں سے تبادلۂ خیالات، معلومات، صحت، شہرت وغیرہ، یہ تمام باتیں ایک سفر ہی کے اثر سے وابستہ ہیں۔

تمام دُنیا کے بانیانِ مذاہب نے عام اِس سے کہ وہ کسی مذہب و ملّت کے حامل ہوں "السّفر وسیلۃ الظفر" کی صداقت کو ایک حد تک تسلیم کر لیا ہی اور ثابت کر دیا ہے کہ اِس پُر معنی جملہ میں دینی اور دنیوی ترقیات کے بیشمار اسرار پوشیدہ ہیں۔

سب سے پہلے دُنیا میں جس شخص نے اِس جملہ کے اثرات کا عملی تجربہ کیا ہی وہ وہ ہی جس کی مقدّس ذات ہر مذہب و ملّت کے نزدیک آبادیِ دُنیا کی بانی مبانی تسلیم کی گئی ہی اور جس کو لفظ **آدم** ؑ سے تعبیر کیا جاتا ہی۔

میں اِس امر کے اظہار سے قطع نظر کرتا ہوں کہ وہ دُنیا میں کب آیا اور آج کتنا زمانہ ہُوا مگر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اِس بزرگ اور واجب التعظیم والاکرام ذات نے واجب الوجود کے منشاء مشیّت کو پاکر پہلا جو کام کیا وہ سفر تھا کیوں کہ اِس ستودہ صفات ذاتِ مقدّس کو دنیا میں آنے کے بعد جو اپنی ڈیوٹی کے لحاظ سے اُن کا فرض تھا وہ آبادیِ دُنیا کی ترقی تھی۔

چوں کہ اِس کو احکم الحاکمین نے ممکناتِ عالم پر اپنا نائب اور حقایق موجودات کا جاننے پہچاننے والا حاکم قرار دیا تھا اِس لئے اِس کو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا وہ معزز خطاب دیا جو سب سے پہلا خطاب تھا اور جو خدائے واحد کی طرف سے بنی نوعِ انسان کو عطا ہُوا تھا۔

اِس بزرگ اور جامع الصفات نے اپنے فرائض کے ادا کرنے میں جو کام انجام دیا وہ یہ تھا کہ دُنیا کی کشادگی پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اپنی اولاد میں سے جس کو جس طرف مناسب خیال کیا روانہ کیا۔

اِن رہروانِ منزلِ معرفت و حقیقت نے اثناءِ سفر میں مختلف حصصِ زمین پر قبضہ کرکے حقایق موجودات پر نظر ڈالی اور اپنی راحت و آرام کے اسباب و وسائل

تلاش کرنے شروع کی، اور اپنے اپنے آباد کئے ہوئے مقام کا نام اپنے نام سے موسوم کردیا۔
جب دُنیا کی آبادی کا درخت ایک حد تک جڑ پکڑ گیا تو اب سفر کی نوعیت معلومات انسانی سے بدل گئی، اور یہ ضرورت اُس وقت تک باقی رہیگی جب تک دُنیا باقی ہے۔
تہذیب، شائستگی، اخلاق، علم، سفرہی کی برکتوں کے اثر کا سرمایہ ہے۔ قدیم یونانی فلسفہ اور حکمت نے سفرہی کے دامن میں پرورش پاکر دُنیا پر روشنی ڈالی تھی اور اب فلسفہ و حکمتِ جدیدہ نے سفرہی کی بدولت نشو و نما پاکر علوم یونانیہ کی غلطیاں نکال کر علوم جدیدہ کی مستحکم بنیاد قایم کردی ہے۔
مغربی اقوام کی جہالت، بداخلاقی، ناشائستگی، پر زیادہ نہیں صرف تین سو برس اُدھر اگر نظر ڈالی جائے تو تیرہ و تار گھٹا چھائی ہوئی نظر آئے گی۔ علم کی تحصیل کو تحصیل حاصل جانتے تھے۔ علم کا دعویٰ تو درکنار جہالت کی شرم بھی کسی کو نہ تھی۔ تہذیب و شائستگی و اخلاق و عادات کاہلی و عیش پسندی کے ایسے گہرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے جن کی بدنما رنگت اُس قوم کے لئے ذلیل دیار ہوگئی تھی۔ مگر انھیں میں سے بہت سے لوگ کھڑے ہوگئے، اور مختلف حصص دُنیا کا سفر کرکے اپنی قوم کی ترقی کے لئے دلیلِ راہ بن گئے آج وہی قوم ہے جس کی اقبال مندانہ ترقیوں میں چار چاند لگ گئے ہیں۔
سفر اخلاقی اور رُوحانی نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے تمدّن اور حسن معاشرت کی اصلاح کرتا ہے۔ صنّاعِ ازل کی دلچسپ نیرنگیاں اور کوہ و صحرا کے مناظر دکھاتا ہے۔ زمانہ اور زمانہ کے طبائع علوم اور علوم کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔

سفر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے اور ایک حد تک اس کا یہ دعویٰ صحیح اور قابل العمل بھی ہے کہ "میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملا دوں گا ہر روز اپنے پیروؤں کو نئے نئے مناظر دکھاؤں گا۔ کسی دل کو ایک دن بھی بیکار نہ پڑا رہنے دوں گا"۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اُس نے فلسفہ کو آسمان سے اُتارا اور انسانوں میں بسایا مگر سفر کا دعویٰ ہے کہ "میں فلسفہ کو مدرسوں اور مکتبوں کی کتبخانوں کی کوٹھڑیوں میں سے نکال کر جلسوں اور چا، و قہوہ پینے والوں کی مجلسوں تک پھیلا دوں گا اور ہر ایک دل پر تہذیب شائستگی اخلاق علم اور روحانی نیکیوں کی روشنی کا اثر ڈالوں گا۔ کاہل شخص کو مستعد و محنتی بنا دوں گا۔ بزدل کو بہادر سپاہیوں کی صفوں میں نمایاں طور پر کھڑے رہنے کی قوت دوں گا۔ تجارت، صناعت، حرفت، زراعت کے طریقوں کو رواج دے کر ترقی اور کامیابی کے ذرائع بتا دوں گا۔ امرا و متمول لوگوں کو غربا کی اعانت اور صلاح حال کی توفیق دوں گا۔ غربا کو متمول بنا دوں گا۔ ہمدردی پاکیزگیِ خیال، تہذیب، شائستگی، خاص باتیں خصوصیت کے ساتھ مجھ سے وابستہ ہیں جو اپنے پیرووں کو دوں گا۔ ہر ملت و مذہب کے پابند کو اُن کی منزلِ مقصود تک پہونچا کر فیضِ زیاراتِ ہادیانِ دین و مذاہب سے کامیاب کروں گا۔ تعصباتِ مذہبی کو زائل کر دینے میں ہر موحد کی پوری مدد کروں گا۔"

میں جہاں تک اپنے خیالات کی وسعت سے کام لیتا ہوں دُنیا میں کسی شخص کو ان دعووں کی تردید کرنے والا نہیں پاتا۔ بیشک سفر ایسا ہی مبارک درخت ہے

جس کی شاخوں میں دین و دُنیا کی کامیابی کے میوے آئے ہوئے ہیں۔ یہی وہ دریا ہے جس کی تہ میں سویلزیشن، تہذیب، شائستگی، علم، اخلاق، پاکیزگیِ خیال، معاشرت، تمدّن، صحت اور عافیت کے کروڑوں چمکدار موتی پڑے ہیں۔ یہ موتی کسی کو نہیں ملتے مگر سفر کرنے والوں کو ملتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں اپنے محدود اور بہت ہی قلیل سفر کے واقعات کو پبلک میں پیش کرتا ہوں جن سے اہل بصیرت اپنی معلومات کو بہت کچھ ترقی دے سکتے ہیں۔ اگرچہ میرا یہ سفر بالکل پرائیوٹ اور سُرعت کا سفر تھا لیکن اِس قلیل المسافت سفر میں بھی جو جو واقعات پیش آئے اُن سب کو قلمبند کر کے صفحۂ روزگار پر یادگار چھوڑتا ہوں مجھے اِس سفر اور سفرنامہ کی ترتیب میں "سیر و تفریح" لالہ شادی رام سے نیز خواجہ صاحب کے حالات میں اخبار توحید سے بہت مدد ملی۔ دونوں کا شکریہ۔

شاد عُفی عنہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سبحانہ وحدہٗ لا شریک لہٗ

اسبابِ سفر اگرچہ ایک بار پہلے میں خواجہ صاحب کے روضہ کی زیارت حاصل کر چکا تھا لیکن مدت سے آرزو تھی کہ حضرت خواجۂ خواجگان ولی الہند شاد نواز کے عرس شریف میں شریک ہو کر سعادتِ دارین حاصل کروں اور عرس کی نیرنگیوں کا تماشا اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو دکھاؤں جو بوقلموں حیرت افزا وحدت کی شان اس کثرت میں نظر آتی ہے۔ لیکن کثرتِ کار و ہجوم افکار سے موقع نہ ملا۔ امسال اُدھر سے کشش اِدھر سے کوشش ہوئی ۲۹-جمادی الاُخریٰ ۱۳۳۱ھ مطابق یکم امرداد ۱۳۲۲ف کو سفر کی تیاری کر دی۔

روانگی ۶-جون ۱۹۱۳ء مطابق ۳۰-جمادی الاُخریٰ ۱۳۳۱ھ روز جمعہ کو شام کی ٹرین میں مع اپنے چند مصاحبین رام چندر پرشاد، مرزا احمد بیگ اور دو ڈریسر، چند خدمتی کے سب کو خدا حافظ کہکر روانہ ہوا۔ اگرچہ میرا خیال تھا کہ مع اہل وعیال حضرت کی

بارگاہ میں حاضر ہوں لیکن برخوردار عثمان پرشاد طال اللہ عمرہٗ کی علالت کا سلسلہ باقی تھا، اس لئے یہ قصد ملتوی رہا۔

اجمیر شریف ۹۔ جون ۱۹۱۳ء مطابق ۴۔ امرداد ۱۳۲۲ف روز صبح کے ۹ بجے گاڑی اجمیر شریف کے اسٹیشن پر پہونچی۔ سید محمد حنیف صاحب نے (جو بارگاہ خواجہ صاحب میں میری وکیل ہیں اور جو اسٹیشن پر موجود تھے) مجھ سے ملاقات کی اور میں مع اپنے مصاحبوں اور ملازموں کے سیٹھ بر دھمل کی کوٹھی میں (جو پہلے سے کرایہ پر لی گئی تھی) داخل ہوا۔

ف۲ گیارہ بجے چاشت سے فراغت پاکر عادۃً قیلولہ کیا۔ ۳ بجے عبدالکریم صاحب تحصیلدار کو جو انتظام کے لئے بلدہ سے بھیجے گئے تھے بلوا کر ضروری ہدایتی احکام جاری کئے۔

ف۳ ساڑھے ۴ بجے میں مع اسٹاف جن میں رامچندر پرشاد صاحب، مرزا احمد بیگ صاحب وعبدالکریم صاحب تحصیلدار و فرزند وکیل صاحب تھے درگاہ شریف کو گیا۔ اللہ اللہ کیا دربار ہے کیا جلالت ہے۔ شاہوں کے شاہ کی بارگاہ عرش پائیگاہ ہے۔ روضۂ اقدس نمونۂ جنت ہے جو آتا ہے سنگِ آستان پر سر جھکاتا ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی ہر قوم و ہر ملت کے لوگ نزدیک و دور سے آتے ہیں اور منہ مانگی مراد پاتے ہیں

راجپوتانہ کے تمام ہندو راجہ مہاراجہ اور مرہٹہ سردار مسلمانوں سے زیادہ اس درگاہ عالی کی وقعت کرتے رہے اور اب تک نہایت ادب و تعظیم سے حاضر ہوتے ہیں

خواجہ صاحب کی سوانح عمری

۷۷۲ برس کا زمانہ گذرا جب حضرت خواجہ صاحب ولی اللہ نے عاشورِ محرم ۵۶۱ھ کو راجپوتانہ کی ظلماتی سرزمین میں اپنے آفتاب جلال کی روشنی پھیلائی اور اپنی جلالتِ شان کا وہ جھنڈا نصب فرمایا جس کا پھریرا قیامت تک اُڑتا رہیگا۔ حضرت کی ولادتِ باسعادت ۵۳۶ھ میں بمقام سیستان ہوئی۔ آپ ابتدا ہی سے دُنیا کی واسطے باعثِ امن و راحت تھے۔ چنانچہ جس زمانہ میں حضرت کی ولادت ہوئی اسلامی دُنیا پر تیرہ و تار گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی تباہی و بربادی عبرتناک تھی ہندوستان میں غزنوی حکومت کے نشان جو محمود غزنوی کے حملوں کے بعد کہیں کہیں پنجاب وغیرہ میں باقی رہگئے تھے مظلوم ہندوؤں کی متفقہ کوشش سے مٹائے جا رہے تھے۔ خراسان اور سیستان وغیرہ میں چنگیزی مغلوں کا سیلاب آیا ہوا تھا جو چُن چُن کر عالم، فاضل، عابد، زاہد، اور برگزیدہ لوگوں کو آبِ شمشیر کی طوفانی موجوں میں بہالے گیا۔ بعض مقامات پر تو بادِ مخالف نے شہر کے شہر بے چراغ کر دیئے تھے چنانچہ نیشاپور میں مقابل والوں نے جو مظالم توڑے اُن کا ذکر تاریخ میں پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُدھر بغداد کی عباسیہ خلافت کی بنیادیں اس چنگیزی بھونچال نے ہلا ڈالی تھیں اگرچہ پہلے ہی خلافت عباسیہ نے سادات بنی ہاشم سے دُنیا کی سرزمین کو خالی کر دینے میں کچھ کم کوشش نہیں کی تھیں ہزاروں سادات بے قصور بغداد کی دیواروں میں چنوالیے گئے اگر اُن کی سفاکا

حکومت اور ظالمانہ سلطنت میں ظلم و ستم کی کچھ کمی رہ گئی تھی تو چنگیزیوں نے اس کو پورا کر دیا۔ خلافتِ عباسیہ پر فتح پانے کے بعد لاکھوں سادات و مشائخ اور علما کا بیدریغ خون بہا دیا گیا تھا ایسی دار و گیر اور مصیبت و آلام کے زمانے میں حضرت خواجہ کی ولادت تمام دنیا کے واسطے امن و راحت کی بشارت ثابت ہوئی پہلا اثر آپ کے وجود کی برکت کا یہ ہوا کہ چنگیزیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ عباسی خلافت کی جگہ دوسری غیور و صاحبِ انصاف و رحم دل حکمراں ہوئے۔ غزنویوں کا بدلہ غوریوں نے ہندوستان سے یہ لیا کہ ہمیشہ کے لئے اس کو فتح کر لیا۔ القصہ حضرت خواجہ کی پیدایش کے بعد آپ کے والد خواجہ غیاث الدین حسن سیستان سے آپ کو لے کر خراسان میں آئے۔ جب آپ کی عمر پندرہ برس کی ہوئی، تو ۵۵۱ھ میں آپ کے والد نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ورثہ میں آپ کو ایک باغ اور ایک چکی ملی تھی۔ حضرت خواجہ نہایت صبر و قناعت کے ساتھ باغ کے درختوں کو پانی کا فیض پہونچاتے اور خاموشی سے زندگی بسر کرتے تھے جس قصبے میں حضرت کا باغ تھا اُس میں حضرت ابراہیم قندوزی نامی ایک مشہور مجذوب بزرگ رہتے تھے۔ ایک دن خواجہ باغ میں پانی دے رہے تھے کہ مجذوب ٹہلتے ہوئے باغ میں تشریف لائے۔ خواجہ نہایت ادب سے دوڑے اور بزرگ مجذوب کو ایک سایہ دار درخت کے نیچے لا کر بٹھایا۔ پھر جلدی سے تازہ تازہ انگوروں کے خوشے لا کر سامنے رکھے اور گردن جھکا کر ادب سے دو زانو بیٹھے۔ حضرت ابراہیم قندوزی خواجہ کے اس اخلاق سے بہت خوش ہوئے اور اپنی بغل میں سے کوئی چیز نکال کر دانتوں سے چبائی اور ہاتھ بڑھا کر خواجہ کے منہ میں ڈال دی اُس کا حلق سے اترنا تھا کہ دوئی کے پردے

اُٹھ گئے وحدت کی منزل سامنے نظر آنے لگی خواجہ پر عالم ہی اور طاری ہو گیا۔ باغ، چکی اور گھر کا اثاثہ کھڑے کھڑے بیچ کر خدا کی راہ میں لُٹا دیا اور سفر کے لئے چل نکلے پھر سمرقند و بخارا گئے وہاں قرآن مجید حفظ کیا اور دیگر علوم تفسیر و حدیث و فقہ وغیرہ سے فراغت حاصل کی جب علوم ظاہری طے فرما چکے تو ارضِ مغرب کے شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے بزرگانِ ملت کی زیارتوں اور مشایخ طریقت کے فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوتے ہوئے موضع ہارون میں پہونچے جو نیشاپور کے پاس ایک مشہور قصبہ تھا۔ وہاں حضرت شیخ عثمان ہارون کی دولت پا بوسی نصیب ہوئی۔ حضرت خواجہ پر شیخ کامل کا بڑا اثر ہوا اور فوراً شرفِ بیعت سے مشرف ہو گئے۔ حضرت شیخ عثمان ہارون ساتویں واسطہ سے حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی چشتی کے مُرید تھے اور حضرت کا سلسلہ نو واسطوں سے آنحضرت صلعم تک منتہی ہوتا ہے مگر اس خاندان کا نام چشتیہ حضرت خواجہ ابو اسحاق کے زمانے سے مشہور ہوا کیوں کہ آپ کا قیام موضع چشت میں تھا جو خراسان کے اطراف میں ایک مشہور آبادی تھی۔ قصہ مختصر حضرت شیخ عثمان ہارون کے ہاتھ پر مُرید ہونے کے بعد چشتی کا لقب خواجہ صاحب کو بھی مل گیا۔

دسویں شوال ۵۶ھ میں اپنے مرشد کے فیوض سے مالا مال ہو کر اور خرقۂ درویشی اور سندِ ولایت لے کر رخصت ہوئے۔ شہر شہر قصبے قصبے کی سیر کرتے اہل اللہ کی صحبتوں سے فائدہ اُٹھاتے بغداد آئے بغداد سے روانہ ہو کر اصفہان پہنچے۔ وہاں ان دنوں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ موجود تھے جنھوں نے حضرت خواجہ کے ہاتھ پہ

بیعت کی اور حضرت خواجہ نے اپنی چادرِ خاص ان کو مرحمت فرمائی۔ اصفہان سے روانہ ہو کر خرقان، استر آباد، ہرات، سبزوار، بلخ، غزنی کی سیر کرتے ہوئے ہندوستان کی جانب توجہ فرمائی۔ چنانچہ آپ سرحد کو عبور کر کے پہلے لاہور میں تشریف لائے اس کے بعد دہلی ہوتے ہوئے اجمیر شریف پہونچے جو ہندوستان کا سیاسی اور روحانی مرکز تھا اس کو آپ نے باطنی دارالخلافہ کے لئے منتخب فرمایا اور ۶۳۳ھ تک جو آپ کے وصال کا سنہ ہے مستقل طور سے آپ اجمیر شریف ہی میں مقیم رہے۔ درمیان میں دو سفر دہلی کے ضرور ہوئے مگر وہ عارضی تھے اور جن کا مقصد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملنا تھا۔ دہلی اُس زمانے میں اسلامی حکومت کا پایۂ تخت تھی اور حضرت خواجہ بختیار کاکی ارشاد باطنی کی غرض سے وہاں کے صاحبِ ولایت بنائے گئے تھے۔

خواجہ بزرگوار کی تشریف آوری کے وقت ۵۶۱ھ اجمیر میں راجہ پرتھی راج راٹھور کی عملداری تھی۔ آپ کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے ۵۸۸ھ ہجری میں شمالی ہندوستان اور اجمیر شریف میں توحید کا پھریرا اُڑنے لگا۔ اور تشریف آوری سے بہتّر سال تک ذات بابرکات سے ظاہری و باطنی فیض جاری رہا۔ ۶ رجب ۶۳۳ھ ہجری کو آپ کا وصال ہوا۔ اُس وقت سے اب تک مزار مبارک مرجع خاص و عام چلا آتا ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلا مشہور اور بہادر بادشاہ سلطان محمود خلجی تھا جو اپنے دارالسلطنت مانڈو (مالوہ) سے اپنی جرأت اور بہادری کا امتحان دے کر شہنشاہ اجمیر کے

دربار میں حاضر ہوا۔ سلطان محمود خلجی نے اجمیر پر فتح پا کر خادمان و مستحقین درگاہ شریف کو مالا مال کر دیا اور مزار شریف کے قریب مسجد جو اب صندل خانہ کے نام سے موسوم ہے اور بلند دروازہ وغیرہ چند عمارتیں تعمیر کرائیں اس کے بعد سلاطین مانڈو (مالوہ) برابر درگاہ کی عمارت میں اضافہ کرتے رہے۔ سلطان محمود خلجی اور اُس کے بیٹے غیاث الدین کو حضرت خواجہ بزرگوار کے مزار مبارک اور اولاد سے خاص عقیدت تھی۔ سلاطین مغلیہ میں سب سے اوّل جلال الدین محمد اکبر شاہنشاہ دہلی کو حضرت خواجہ سے عقیدت پیدا ہوئی۔ اِس شہنشاہ کے حالاتِ عقیدت اِس قدر مشہور ہیں کہ اس مضمون میں اُن کے بیان کی گنجائش نہیں بیسیوں مرتبہ دربارِ عالی میں حاضر ہوئے۔ آگرہ سے اجمیر تک پیادہ پا سفر کیا۔ ہر منزل پر چاہ، محلات، باغات وغیرہ لگوائے۔ اجمیر شریف کو تھوڑی ہی مدت میں ایک عالیشان شہر بنا دیا۔ درگاہ شریف میں رفیع الشان عمارتیں تعمیر کرائیں فتح چتوڑ کی یادگار میں دیگ کلاں چڑھائی۔ خدا کی قدرت دیکھیے جس دن یہ عقیدہ پیدا ہوا فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ عقیدت میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔

اکبر کے بعد جہانگیر اور جہانگیر کے بعد عالمگیر اپنے اپنے عہد حکومت میں بخلوصِ ارادت حاضر ہوئے۔ روضۂ منورہ کے پاس سنگِ مرمر کی عالیشان و خوشنما جامع مسجد شاہجہاں کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ جو سب سے پہلی شاہجہانی تعمیر اور درگاہ شریف کی بہترین نورانی عمارت ہے۔ مگر جو عقیدت و ارادت مغلیہ خاندان میں جہاں آرا بیگم بنتِ کلاں شاہجہاں بادشاہ کو خواجہ بزرگوار سے تھی ایسی کسی کو نہ تھی جب یہ

شاہزادی اپنے باپ کے ہمراہ اِس طرف آئی ہی اور چند روز تک لبِ تالاب اناساگر قیام رہا ہے اِس عرصہ میں ادب و تعظیم کے خیال سے پلنگ پر نہیں سوئی نہ روضہ منورہ کی طرف پاؤں دراز کئے نہ پُشت کی جب روضۂ منورہ میں حاضر ہو کر گنبد شریف میں داخل ہوئی تو سات مرتبہ مزارِ مُبارک کا طواف کیا اپنی پلکوں سے جھاڑو دی مزار کی خاکِ پاک کو توتیائے چشم بنایا۔ مزارِ مبارک نقرئی مجحر اور خوشنما بیگمی دالان شاہزادی جہاں آرا بیگم کے حُسنِ عقیدت کی یادگار ہی۔ درگاہ شریف کے جملہ خدام حافظ، خطیب، مولودخوان، فرّاش، باورچی وغیرہ سب شاہزادی جہاں آرا بیگم کے ملازمین کی اولاد میں ہیں۔ جو نسلاً بعد نسلٍ اُسی وقت سے اپنے کارِ خدمت پر مامور چلے آتے ہیں۔

حضرت خواجۂ خواجگان کی عمر ستّانوے برس کی ہوئی۔ خواجہ بزرگوار باعتبار نسب حسینی سیّد ہیں شجرہ یہ ہی:۔

خواجہ معین الدین حسن بن مولانا غیاث الدین حسن بن سید احمد حسن سنجری بن سیدحسین احمد بن نجم الدین طاہر بن خواجہ عبدالعزیز بن سیّد محمد بن حضرت امام علی نقی بن حضرت امام محمد تقی بن حضرت امام علی موسیٰ رضا بن حضرت امام موسیٰ کاظم بن حضرت امام جعفرِ صادق بن حضرت امام محمد باقر بن حضرت امام زین العابدین بن حضرت سیدّ الشہدا امام حسین بن حضرت امیرالمومنین وصی رسول رب العالمین علی بن ابی طالب علیہم السّلام۔

اجمیر کی عام حالت

یہ شہر راجپوتانہ کا انگریزی ہیڈکوارٹر ہی۔ ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کا اسی جا قیام رہتا ہی۔ گو شہر بہت بڑا نہیں مگر بارونق ہی۔ شہر کے گرد فصیل ہی جس میں پانچ دروازے ہیں۔ اس شہر کو چاروں طرف سے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے احاطہ کرلیا ہی جس کی وجہ سے یہاں کی ہوائیں خوشگوار پیدا ہوگئی ہی۔ خواجہ کا مزار پہاڑ کے دامن میں نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ درگاہ سنگ مرمر کی ہی۔ مزار شریف کے چاروں طرف چاندی کا کٹہرہ ہی دروازوں پر آئینہ بندی کی گئی ہی۔ مزار شریف پر ہمارے حضور اعلیٰحضرت قدر قدرت فتح جنگ نظام الدولہ نظام الملک آصفجاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر جی سی ایس آئی خلد اللہ ملکہٗ نظام دکن نے کارچوبی غلاف اور ایک کارچوبی شامیانہ بیش قیمت چڑھایا ہی اور دوسرا غلاف اور شامیانہ عنقریب بھی حضور ہی کا نذر گذرانا ہوا ہی درگاہ بازار سے درگاہ میں داخل ہونے کے لئے ایک صدر دروازہ عالیشان حضور اقدس و اعلیٰ کی طرف سے بنوایا جا رہا ہی۔ اس درگاہ کے احاطہ میں دو مسجدیں نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہیں جن میں بڑی مسجد جو سنگ مرمر کی ہی شاہجہاں بادشاہ کی بنوائی ہوئی ہی جس کا ذکر اوپر آچکا ہی اسی درگاہ میں دو بڑے بڑے نقاروں کی جوڑی بھی رکھی ہی جو فتح چتوڑ کے بعد جیمل فتے کی اکبر بادشاہ اُٹھا لایا تھا۔ دو دیگیں بھی بڑی بڑی یہاں ہیں جن میں سے ایک میں ۸۰ من اور دوسری میں ۱۲۰ من چاول پک سکتے ہیں۔ درگاہ سے کچھ فاصلے پر ایک بہت پُرانی عمارت "اُڑھائی دِن کے جھوپڑے" کے نام سے مشہور ہی یہ ایک بڑا لمبا دالان ہے

جو سنگِ سُرخ کا بنا ہوا ہی۔ بہتّر ستونوں پر استادہ ہی۔ بیچ میں ایک جانماز اور میز سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہی۔ اُس کے ستون اور چھت میں ہمیشہ گلکاری کی ہوئی ہی۔

پشکر۔ اجمیر سے ۷ میل کے فاصلے پر پہاڑوں کے بیچ میں واقع ہی۔ اجمیر سے پشکر جاتے وقت تانگہ یکہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر سے گذرتا ہی۔ اِن پہاڑوں کے پتھر دھوپ میں اِس طرح چمکا کرتے ہیں جیسے شبِ تاریک میں آسمان پر تارے۔ معلوم ہوتا ہی کہ اِن پتھروں میں ابرک کا جُز زیادہ ہوتا ہی۔ راستے میں لنگور بھی بہت ہیں۔ یہاں ایک جھیل ہی جس کے چاروں طرف گھاٹ اور مندر بنے ہوئے ہیں۔ جھیل کے بیچ میں ایک چھوٹی سی مڑھی ہی جس کو "برھما کی جگی" کہتے ہیں یعنی یہاں برھما نے جاگ کیا تھا۔ یہاں برھما کا ایک مندر بھی ہی جس میں برھما کی چومکھی مورتی اور اُس کے چاروں لڑکوں کی مورتیں بھی بنی ہوئی ہیں اس کے سوا تمام ہندوستان میں برھما کا مندر اور کہیں نہیں ہی۔ اِس جھیل میں پانی بے انتہا ہی۔ مگرمچھ اور کچھوے وغیرہ پانی کے تمام جانور بہت ہیں جو آدمیوں پر بھی چوٹ کرتے ہیں ہندو اِس جھیل کو "پرتھوی کا نینتر" (زمین کی آنکھ) کہتے ہیں اور بہت متبرک سمجھتے ہیں اور تیرتھوں کی طرح یہاں بھی ... سو پنڈے ہیں۔ پشکر کے علاوہ یہاں ایک بڑی جھیل اور بھی ہی جو آنا ساگر کہلاتی ہی۔ ہر کاتک کے مہینے میں بڑا میلا ہوتا ہے اس میلہ میں اونٹ گھوڑے ہاتھی دُور دُور سے فروخت کے لئے آتے ہیں۔ دولت باغ میں چیف کمشنر صاحب کی کوٹھی ہی اور اُس کے سامنے ریلوے کا بڑا دفتر ہی یہاں سے ایک میل پر میو کالج ہی جس میں تمام راجپوتانہ کے راج کنور پڑھتے ہیں۔ اسٹیشن کے

قریب ہی ریل کا بڑا بھاری ورکشاپ دیکھنے کے قابل ہی۔

الغرض خواجہ بزرگوار کی زیارت سے مشرف ہوکر احاطۂ بارگاہ کے اندر جس قدر مزارات تھے اُن کی زیارت سے فراغت حاصل کرکے کچھ دیر حضرت عثمان فاروق قدس سرہٗ کی بائیں سطح میں بیٹھا اور جلالتِ روضۂ منورہ پر ایک گہری آرزومندانہ نظر ڈالی۔ دل کو آستانۂ مبارک کی طرف رجوع کیا۔ اللہ اللہ ناز و نیاز کے جلووں نے اس قدر محوِ حیرت کردیا کہ دل کی ایک بھی تمنا حرفِ مدعا بن کر زبان تک نہ آئی "ادنی" کہنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ خدا جانے میں کہاں تھا۔ روضہ کس کا قبر کس کی ؎

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہی وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی توکہیں دوچار ہوتا

مجھ پر اُس وقت ایک بے خودی طاری تھی اسی بے خودی کے عالم میں بیساختہ میری زبان پر یہ مطلع آیا ؎

کیسی کثرت میں تری وحدت کا چرچا ہوگیا　　راز کس پردہ کا تھا اور کیسا افشا ہوگیا

اَب میں نے اپنی طبیعت پر کسی قدر زور ڈالا تو ایک اور مطلع ذہن میں آیا۔

عالمِ ذرّات کا عالم تماشا ہوگیا　　ایک کُن سے کیا ہوا اور کیا سے کیا کیا ہوگیا

اب تو طبیعت آمادہ ہوگئی کہ اس میں کچھ اور اشعار بڑھائے جائیں۔

آئے وہ بہرِ عیادت مژدہ باد اے زندگی!　　کچھ دنوں دنیا میں رہنے کا بہانا ہوگیا
وائے ناکامیِ نظّارہ جب آئے وہ یہاں　　جلوۂ عارض سے میں غش مثلِ موسیٰ ہوگیا

جانتے ہیں اپنا اپنا زاہد و راہب تجھے
کیا ترا ہر مذہب و ملّت میں چرچا ہو گیا

بلبلے جوشِ گریۂ بیچارگیِ شوقِ دید
ایک قطرہ پھیل کر زخّار دریا ہو گیا

دیکھتے تھے تجھکو جب چشمِ تمنا بند تھی
دیدہ و دانستہ آنکھیں کھل کے پردا ہو گیا

اہلِ عرفاں دُور سے آ آکے کرتے ہیں طواف
آستانِ بے مثالِ دوست کعبا ہو گیا

اب میں بارگاہِ عالی سے شب کے آٹھ بجے مکان کو یہ کہکر واپس ہوا کہ " الٰہی بیکساں را بوسیلہ نیکی سرفرازی بخش و بداں را بمقتضاے کرم دل نوازی کن "۔

حوائج ضروری سے فرصت پاکر ½ ۱۱ بجے شب کو مع اپنے مذکورہ مصاحبوں کے پھر درگاہ کو گیا۔ اِس وقت کا سماں کچھ اور ہی رنگ اپنا دکھا رہا تھا۔

آستانِ جلال پر پیشانی رکھ کر سعادت کے چہرے کو روشن کیا اور زیارت سے مشرف ہو کر محفل کے مکان میں جا کر بیٹھا۔ وہاں دیوان صاحب سے ملاقات ہوئی یہ سماع خانہ سر آسمان جاہ مرحوم کا بنوایا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آسماں جاہ جو ہماری ریاست ابد مدت کے سربرآوردہ امرا ا سے تھے) خدا بخشے نہایت خوبیوں کے نیک دل اور خوش عقیدت امیر تھے اِس قسم کے بیسیوں خیراتی کام اُنھوں نے دنیا میں کئے اور آخرت کے لئے ساتھ توشہ لے گئے ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

½ ۱ بجے میں وہاں سے برخاست کر کے پھر درگاہ شریف میں حاضر ہوا اور روضہ غسل کا وقت تھا۔ بیرونی جالی کے قریب بیٹھکر اس سکوت اور سنّاٹے کے عالم میں

جو اکثر دوپہر شب کے بعد ہوا کرتا ہے۔ اس کے جلوے کو دیکھا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خواب گاہ
میں نوشاہ آرام میں ہیں اور براتی اُس کے جگانے کے لئے جا رہے ہیں مگر چشم بصیرت میں
کہتی تھی کہ خواجہ اُن لوگوں میں نہیں جو دنیا کو عالم بیداری سمجھیں بلکہ وہ اس عالم خواب میں
بھی مثل عالم بیداری کے جلوہ افروز ہیں صرف برائے نام خواجہ ہیں ورنہ جس کا مظہر
خواجہ صاحب کہلاتے تھے اور اب جس دریا میں فنا فی الذات ہو کر بقائے نام کے
جلوے دکھا رہے ہیں اُس کو خواب کہاں۔ اتنے میں رنگیلے شاہ نام ایک صاحب
آئے گفتگو سے معلوم ہوا کہ مولانا حضرت فضل رحمٰن علیہ الرحمہ مراد آبادی کے دیکھنے والوں
میں سے ہیں۔ درحقیقت طبیعت کے چلبلے اور رنگیلے ہیں انھوں نے مجھ سے میں نے
اُن سے ملاقات کی۔ قریب ۲½ بجے شب کے دروازہ کھلا۔ دیوان صاحب مع
خدام باہر آئے اور قریب تین بجے شب کے میں مع مصاحبین کوٹھی کو واپس ہوا۔

۱۰- جون سنہ ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۲ امرداد سنہ ۱۳۲۲ف

حوائج ضروری سے فراغت پاکر ۸ بجے درگاہ شریف کو جانے
کے لئے تیار ہوا کہ بصرہ والے سید محمد صاحب آ گئے اُن سے
ملاقات کی۔ انھوں نے ایک کشتی تبرک کی جس میں ایک کہربا کی تسبیح اور ایک شیشی
عطر اور تازہ کھجوریں تھیں پیش کی ۵ منٹ اُن سے بات چیت کرکے مع مصاحبین
درگاہ شریف کو گیا۔ زیارت سے مشرف ہو کر دیگ کو (جس کا سامان پہلے سے کیا گیا
تھا) لٹتے ہوئے دیکھنے کے بعد مکان کو واپس ہوا اور سالک مسالک طریقت، ناہج
مناہج معرفت، حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی سے شرف نیاز حاصل کیا جو

تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب سے دلّی کے دربار میں نیاز حاصل کیا تھا۔ جب سے حضرت اپنے خادم شاد ناشاد کے حال پر نوازش فرماتے ہیں۔ اگرچہ حضرت محبوب الٰہی کے ہمشیرہ زادے ہونے کا فخر رکھتے ہیں لیکن نسب فروش نہیں ہیں بلکہ ذاتی خوبیوں سے آراستہ اور فقر و فخر کے لباس سے پیراستہ ہیں۔ چشم گریاں و دلِ بریاں رکھتے ہیں۔ باخبر صوفی، عارف و نہایت وجیہ مشین، زندہ دل اور خوش مذاق ہیں۔ درویشی میں دلِ پر اثر کے ساتھ قلم میں بھی جادو ہے جس کو تمام دنیا جانتی ہے۔ اخبار توحید میرٹھ کے آنریری چیف اڈیٹر اور سرپرست بھی ہیں۔ جادو نگاری و شیوا بیانی میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ حضرت کی روانگی کے بعد کالے شاہ سے ملا۔ یہ صاحب حضرت خاموش صاحب کے ارادت مندوں سے ہیں جن کا شہر خموشاں بسایا ہوا دکن میں ہے۔ چونکہ حضرت شاہ خاموش صاحب کے ساتھ آسماں جاہ مرحوم کی دلی عقیدت تھی اس لئے آسماں جاہ مرحوم نے درویش کالے شاہ کو اپنی طرف سے سماع خانہ درگاہِ خواجہ کا منتظم بنایا تھا۔ اب تک اسی خدمت پر مامور ہیں۔ اس کے بعد رنگیلے شاہ صاحب آئے اُن سے ملا ۱۱½ بجے برخاست کر کے رام چندر پرشاد کو کالے شاہ کے ساتھ جا کر سیٹھ مولچند کی کوٹھی دیکھنے کے لئے حکم دیا۔ آج چودھری نصرت علی صاحب سے ملاقات ہوئی جو اودھ کے عمائد سے ہیں۔ نہایت ذی علم بااخلاق اور متین آدمی ہیں۔ دیر تک اُن سے لطفِ صحبت رہا۔ قریب ۳ بجے کے حافظ ہدایت اللہ صاحب چشتی آئے یہ دیوانجی صاحب کے عقیدت مندوں سے ہیں

اور مجھ سے بھی محبّت رکھتے ہیں نہایت نیک طینت آدمی ہیں اِن سے ملاقات کرکے مع مصاحبین گاڑی میں سوار ہو کر دیوان صاحب کے مکان پر گیا اُنھوں نے نہایت گرمجوشی اور مہربانی کے ساتھ مجھ سے ملاقات کی۔ رخصت ہونے کے وقت ایک دستار میرے سر پر باندھی اور ایک شمشیر مع پرتلے کے عنایت کی جو میری کمر کی قوّت اور زینت کا سبب ہوئی اور ایک کشتی بچّوں کے خلعت کے ساتھ کی جو ہمیشہ کا معمول ہے۔ قریب ۴½ بجے کوٹھی کو واپس ہوا۔ شام کے وقت درگاہِ شریف کے نقّارچی و روشن چوکی والے سلام کو آئے اِن کو انعام وغیرہ دے دلاکر واپس کیا۔

۱۱- جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۶- امرداد ۱۳۲۲ف آج میں ۹ بجے حضرت پیر جی سیدی ابراہیم صاحب بغدادی کی ملاقات کو گیا اور ۲ بجے واپس آیا۔ یہ بزرگ زادے حضرت پیر مصطفٰے صاحب بغدادی قادری مرحوم کے نوجوان صاحبزادے ہیں اور بڑے باخبر اور صاحب نظر ہیں۔ آپ کے والد بزرگ عرب اور ہند میں آفتابِ آسمانِ ولایت مانے جاتے تھے کہا یہ جاتا ہے کہ اُن کے والد کے عرب اور ہندوستان میں تقریباً دولاکھ مریدوں کی تعداد ہے۔ میں شام تک پھر کہیں نہیں گیا۔

۱۲- جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۷- امرداد ۱۳۲۲ف آج میں ۸½ بجے صبح کے مع مصاحبین خواجہ حسن نظامی صاحب کی ملاقات کے لئے اُن کے مکان پر گیا اور ۱۰ بجے واپس ہوا آدھا گھنٹہ دم لے کر ۱۰½ بجے درگاہ شریف کو گیا محفل کے مکان میں متولی صاحب و دیوان صاحب سے ملاقات ہوئی ۲ بجے ختم پڑھا گیا۔ ۴ بجے برخاست کرکے درگاہ شریف کی

زیارت کرکے کوٹھی کو واپس ہوا اور اپنے سکرٹری اسٹیٹ کو حیدرآباد میں بذریعۂ تار حکم دیا
کہ میرے محلات کو مع ضروری سامان کے لے کر فوراً بمبئی آجاؤ۔ ۶ بجے شام کو دیوان
صاحب مع حافظ ہدایت اللہ صاحب میری ملاقات کو آئے۔ ایک کشتی تبرک کی مجھے
دی اور ایک دستار اپنے ہاتھ سے میرے سر پر باندھی۔ میرے ایما پر رام چندر پرشاد نے
پھول پان کے ساتھ اڑھائی سو روپیہ دیوان صاحب کو نذر گزرانے۔ وہاں سے
میں اور دیوان صاحب ایک گاڑی میں سوار ہوکر اسلامیہ اسکول میں جو تعمیر ہو رہا ہے
آئے۔ دوسری گاڑی میں میرے مصاحبین تھے۔ ایک ہزار روپیہ میں نے چندہ دیا۔

۱۴- جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۹- امرداد ۱۳۲۲ف

آج میں ساڑھے نو بجے شب کے اجمیر شریف سے مع اپنے چند مصاحبوں اور خدمتیوں کے بمبئی کو روانہ ہوا۔ باقی اسٹاف کو میں اجمیر ہی میں چھوڑ گیا۔ راستے میں معمولی واقعات کے سوا کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو قابل اندراج روزنامچہ ہذا ہوتا۔

۱۵- جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۰- امرداد ۱۳۲۲ف

۹½ بجے صبح کے میں بمبئی کے چرچ گیٹ اسٹیشن پر پہنچا اور سیدھا کشمیری ہوٹل میں چلا گیا۔ اس کی حالت متوسط درجے میں ہے۔ اس کے منیجر لالہ ٹیک چند کھتری نہایت بااخلاق اور سنجیدہ اور مہذب آدمی ہیں۔ اس میں مقیم ہونے والے کی ہر قسم کی آسائش و راحت کو وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ چاشت سے فراغت پاکر ۱۲ بجے دن کے تاج محل ہوٹل میں گیا۔ یہ ہوٹل اپالو بندر پر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ عمارت کے اعتبار سے یہ ہوٹل درحقیقت بمبئی کی عمارتوں

کا سرتاج ہے۔ روکار اس کا اس قدر خوش نما ہے کہ ناظرین کی نظر کو اپنی طرف کھینچکر گھنٹوں نہیں چھوڑتا فرنیچر اسباب آسائش اس کا اعلیٰ درجہ کا ہے۔ میں اس ہوٹل کی چوتھی منزل پر ایک کمرہ میں مقیم ہوا لیکن شب کو میں اپنے سیلون میں چلا گیا۔ محلات کے مقام کے لئے مسٹر قدوانی کے ذریعہ سے ملابار ہل میں ایک کوٹھی کا انتظام کیا گیا تھا۔ محلات کو اُسی کوٹھی میں اُتروا دیا گیا۔ زنانہ اسٹاف میں میرے دونوں داماد (یعنی لالہ تاراچند (معروف بڑے دولھا راجہ) اور لالہ اقبال چند (معروف چھوٹے دولھا راجہ) بھی تھے۔ محمد معصوم علی صاحب (اپنے سکرٹری) سے شہر کے حالات دریافت کئے اور ضروری کاغذات دستخط کرکے آرام کیا۔

بمبئی کی عام حالت پر ایک اجمالی نظر

اگرچہ کلکتہ باعتبار آبادی، وسعت و تجارت و تہذیب اور ہندوستان کا دارالخلافہ ہونے کے لحاظ سے بڑا ہو لیکن اگر بمبئی کی عام حالت پر نظر ڈالی جائے تو یہاں کے باشندوں کی عام خوبصورتی عورتوں کی عشوہ کاری و حسن فروشی اور آزادانہ سادگی سمندر کے نظارے موسم کا اعتدال، تجارت کی گرم بازاری ہر دیکھنے والے کو اس مصرعہ کے پڑھنے پر مجبور کردے گی کہ ؎

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

یورپین سیاح اس بمبئی کو "ہندوستان کی آنکھ" کہتے ہیں۔ اُن کا قول ہو کہ ایشیا

ہیں دوسرا شہر اس کے مقابل کا نہیں۔

اس شہر میں بارہ اسٹیشن ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ بائی کلا، گرانٹ روڈ، چرنی روڈ، میرن لائنس، چرچ گیٹ اسٹریٹ، مہالکشمی، پیرل، الفنسٹن روڈ، داور، وکٹوریہ ٹرمی نس اور قلابہ وغیرہ۔

یہاں ٹھہرنے کے لئے علاوہ ہوٹلوں کے کئی بڑے بڑے دھرم شالے بنے ہوئے ہیں جن میں سے ایک جو حال ہی میں بنا ہی ہیرا باغ کہلاتا ہی۔ یہ سیٹھ مانک چند جی نے اپنے والد سیٹھ ہیرا چند جی مرحوم کی یادگار میں سوا لاکھ روپیہ لگاکر بنوایا ہی۔ گو سیٹھ صاحب جینی ہیں مگر اُنھوں نے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ہر مذہب کے ہندو کو ایک ہفتہ تک ٹھہرنے کی عام اجازت دے رکھی ہی۔ اس کے قریب ہی ایک ہندوؤں کا بھی بڑا دھرم شالہ ہی جسے مادھو باغ کہتے ہیں۔ ان دھرم شالاؤں میں ٹھہرنے کے لئے چرنی روڈ کے اسٹیشن پر اُترنا چاہیئے۔

اِس شہر کے سب بازار بہت لمبے اور دلّی کے چاندنی چوک کی طرح کشادہ ہیں۔ دونوں جانب بڑے اونچے اونچے محل نما عالی شان مکان آسمان سے باتیں کر رہے ہیں جن میں زیادہ کام پتھر کا ہی۔ سڑکوں پر ٹریموے کی دوہری لائنیں ہیں جن کے آس پاس گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے پکّی سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ بازاروں میں ہر وقت وہ بھیڑ بھاڑ رہتی ہی جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہی۔ ایک طرف سے ہوا کی طرح ٹریموے دوڑی جاتی ہی دوسری طرف سے موٹر کار زمین کی طنابیں کھینچتی آتی ہی۔

تیسری طرف گاڑی والا بچو بچو کی صدا لگا رہا ہے۔ چوتھی طرف بائیسکل والا ٹن ٹن کی خوش نما آواز سنا رہا ہے۔ اس پر بھی راہگیروں کی وہ ریل پیل ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ اوپر کی طرف جب نظر اٹھتی ہے تو تاروں کے جال تنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تار کچھ ٹرموے کے کچھ بجلی کی روشنی کے کچھ بجلی کے پنکھوں کے کچھ ٹیلگراف اور ٹیلیفون کے ہوتے ہیں۔ دکانیں قسم قسم کے سامان سے بھری پڑی ہیں۔ شہر کیا ہے انسانی زندگی کا میگزین ہے جس طرف نکل جاؤ یکساں بازار، یکساں دکانیں، یکساں مکانات دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ جس طرف جائیے جدھر نظر کیجئے ایک سے ایک حسین عورت گورے گورے
بازو اور پیٹ کھولے سینہ ابھارے ریشمی ہیلا رساری سے زینت کئے پھر رہی ہے ۵

مزے کی چیز ہے یہ مجمعِ حشر
حسین کیا کیا گزرتے ہیں نظر سے

عموماً ہر بازار، ہر دکان اور ہر مکان میں بجلی کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے دفاتر میں بھی بجلی ہی سے پنکھے عہدہ داروں کی ہوا داری کا دم بھر رہے ہیں یہاں ہر ایک صیغہ کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر ہے۔

بمبئی کے تین طرف سمندر اور ایک طرف خشکی ہے۔ شہر کی صورت مدوّر ہے۔ انسان جہاں سے چلے آخر کار اسی مرکز پر آجاتا ہے جہاں سے چلا تھا۔ یہاں بھی دکان دار اکثر ایک ہی قیمت بولتے ہیں۔ یوں تو یہاں ہر قوم و ہر ملک اور ہر ملت کے باشندے دیکھنے میں آتے ہیں مگر زیادہ آبادی گجراتی، مرہٹی، مارواڑی، پارسی

میمن اور بوہروں کی ہے۔گجراتی زبان زیادہ بولی جاتی ہے۔

اس شہر میں بہت بڑے بڑے تالاب اور ہر مذہب کے معابد ہیں۔سمندر کے کنارے کنارے پکّی سڑک بنی ہوئی ہے۔لوگوں کے بیٹھنے کے لئے بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔رات کو بجلی کی روشنی ہوتی ہے اور ہر روز شام کے وقت میلا لگا رہتا ہے ہزاروں آدمی سمندر کو آتے ہیں۔گاڑی موٹر کار ایک پر ایک چڑھی جاتی ہے۔صبح سے شام اور شام سے صبح تک کسی کا وقت بے کار نہیں جاتا ہر ایک اپنے اپنے کام میں مصروف اور مشغول پایا جاتا ہے۔پارسی لوگ سمندر کے عین کنارے کھڑے ہوکر دعا مانگتے ہیں۔کوئی کمر سے رسّی کھول کر اسے مالا کی طرح جپتا ہے۔کوئی سمندر کے پانی کو آنکھوں سے لگا کر کچھ پڑھتا ہے۔کوئی گھٹنے ٹیک کر سجدہ کرتا ہے۔غرض سمندر کے کنارے ہر روز خوب چہل پہل رہتی ہے۔

سمندر کے کنارے کئی بندر بنے ہوئے ہیں جو گودی کہلاتے ہیں۔ان پر سواری اور مال کے جہاز آکر ٹھہرتے ہیں۔ان کے نام یہ ہیں۔اپالو بندر۔ بوری بندر بلیٹ پارڈ اور پرنسس ڈاک وغیرہ۔ پرنسس ڈاک سب سے بڑا بندر ہے۔اس کا میلوں تک پکّا پلیٹ فارم بنا ہوا ہے۔سیکڑوں جہاز ہر وقت یہاں کھڑے رہتے ہیں۔لاکھوں کا مال اترتا چڑھتا ہے۔ہر قوم و ہر ملک کے لاکھوں آدمی یہاں رہتے اور کام کرتے ہیں گویا یہ بجائے خود ایک شہر بسا ہوا ہے۔ایک سرکاری گودی ہے جس میں لڑائی کے جہاز رہتے ہیں یہاں بھی ہزاروں آدمی روز کام کرتے ہیں۔ اپالو بندر میں

سواریاں اُترتی چڑھتی ہیں اس کے سامنے ہی تاج محل ہوٹل کی شاندار عمارت ہی جو ۶ ، ۷ منزل اونچا اور ہندوستان کے تمام ہوٹلوں سے بڑا اور خوشنما ہی۔ اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

"بالکیشر" یہ چوپاٹی سے اِس طرف سمندر کے کنارے ایک بستی کا نام ہی۔ یہاں ایک تالاب جو بان گنگا کہلاتا ہی بنا ہوا ہی اور اس کے پاس ہی بالکیشر مہادیو کا مندر ہی اس کے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی پہاڑی ہی جسے مالابار ہل کہتے ہیں چونکہ مقام اونچا ٹھنڈا سرسبز اور سمندر کے کنارے ہی اس لئے صاحب لوگوں کی کوٹھیاں زیادہ تر اسی جگہ بنی ہوئی ہیں۔ گورنر بمبئی بھی اسی جگہ رہتے ہیں۔ یہاں ایک تالاب ہی جس کے اوپر چھت ڈال کر چھت کے اوپر باغ لگایا ہی۔ اس شہر میں کمپنی باغ بہت سرسبز اور شاداب ہی اس میں قسم قسم کے پودے اور درخت ہیں۔ چڑیا خانہ اور عجائب گھر بھی اسی میں ہی۔ یوں تو اس صوبہ میں کپڑا بُننے کی ہزاروں کلیں ہیں مگر ریشم کی مل جو خاص بمبئی شہر میں ہی قابل دید ہی۔ یہ بہت بڑی مل ہی اس میں ریشم کی ساریاں ڈوپٹے رومال اور ریشمی تھان تیار ہوتے ہیں اور قریباً ایک ہزار آدمی روزانہ کام کرتے ہیں۔

فورٹ یعنی قلعہ میں بڑے بڑے سوداگروں کی کوٹھیاں بنک اور کارخانے ہیں چیف کورٹ بھی یہیں ہی قلعہ کی دیواریں مسمار ہو گئی ہیں۔ اب یہ سڑک ہی قلعہ کہلاتی ہی۔ یہ سڑک بڑی دور تک یعنی قلابہ تک چلی گئی ہی اس کے دونوں طرف

بڑی بڑی عالی شان عمارتیں ہیں۔ سڑک پر اسفلٹ کا چھڑکاؤ ہوتا ہے جو تارکول کی قسم ہوتی ہے اس سے مہینے بھر تک تو گرد دبی رہتی ہے۔ مگر جب تازہ چھڑکی گئی ہو تو چلنے والوں کے کپڑے چھینٹ لگ کر خراب ہوجاتے ہیں۔ اس کا چھڑکاؤ مہینے میں ایک بار ہوتا ہے

اخبار ٹائمس آف انڈیا جو ہندوستان میں سب سے بڑا اخبار سمجھا جاتا ہے اُس کا دفتر بھی یہیں ہے اس میں روزانہ سیکڑوں آدمی کام کرتے ہیں۔ قلعہ کے پاس ہی ایک دوسری سڑک پر ٹکسال ہے جس میں ڈالر روپے، اکنّی اور پیسے بڑی صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بنتے اور تولُ پرکھا کر تیار ہوتے ہیں۔

ایلی فنٹا کے غاری مندر بمبئی کی سب سے مشہور چیزوں میں سے ہیں یہ مندر سمندر کے کنارے ایک پہاڑ کھود کر بنائے گئے ہیں بمبئی سے چھ سات میل کے فاصلے پر ہے کشتی یا اگن بوٹ میں بیٹھکر جانا پڑتا ہے۔

۱۶- جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۱- امرداد ۱۳۲۲ف آج میں ٹھیکر کمپنی کی شاپ میں گیا۔ اس شاپ کو اسٹیشنری سامان کا میگزین کہا جائے تو بیجا نہیں ہر قسم کا اسٹیشنری سامان اور کتب خانہ اس میں موجود ہے۔ وہاں سے واپس ہوکر مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا کوٹھی گیا اور وہاں سے بارہ بجے شام کے پھر تاج محل ہوٹل میں چلا گیا وہاں کے دلچسپ مناظر سے مجھے ایک خاص دلچسپی تھی۔ اس کے سامنے سمندر ہے جس میں نزدیک و دُور جہازوں کا ایک مقام پر ایک سکوت اور بُردباری کے ساتھ کھڑا ہونا، دخانی کشتیوں کا اِدھر اُدھر اٹھلا اٹھلا کر چلنا، اور سمندر کی موجوں کو اپنی مستانہ

رفتار سے متلاطم کرنا، ایک خاص کیفیت کا نظارہ پیدا کرتا تھا۔ بعض احباب میری ملاقات کو آئے ہوئے تھے جن سے یہیں ملا۔ دو گھنٹے یہاں کے منظر سے لطف حاصل کر کے ۹ بجے کوٹھی کو واپس ہوا۔

حضور پر نور خلد اللہ ملکہ، سال گزشتہ جس زمانہ میں بمبئی تشریف فرما ہوئے تھے اُس وقت میں نے ایک نظم میں بمبئی کے حسن و قبح کی سچی تصویر کھینچکر دکھائی تھی اس میں چند اشعار اور اضافہ کر کے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

بمبئی کیا تیری اعلیٰ ہے شان	شاہِ آصف ہوئے تیرے مہمان
تیری تقدیر کو اب اوج ہوا	اب ترے حسن کا سودا ہوگا
نام ملکوں میں ہے تیرا مشہور	سیر تیری ہے ہر اک کو منظور
سن میں تو گرچہ بہت بڈھی ہے	نوجوانوں سے مگر اچھی ہے
حسن اور شان ہے تیری اعلیٰ	جمع سامان ہیں تجھ میں کیا کیا
کون سی شے ہے وہ جو تجھ میں نہیں	اچھے اچھے ہیں ترے پاس نگیں
اچھے اچھوں کو رجھاتی ہے تو	سب دماغوں میں ہے تیری خوشبو
دلفریبی میں ہے اوّل سب سے	دلربائی میں ہے افضل سب سے
تجھ میں کیا شانِ خود آرائی ہے	حسن ہے آن ہے رعنائی ہے
راستے تیرے بڑے اور وسیع	ہیں مکاں اونچے بلند اور رفیع
شاہیں اعلیٰ ہیں ٹھیٹر اعلیٰ	ہسپتال اور مدارس ہر جا

مارکٹ گرنیاں اور ہیں بازار　　رات دن ہوتا ہے جن میں بیوپار
ہیں کلب اور کتب خانے بھی　　اپنے بھی آتے ہیں بیگانے بھی
جتنے دفتر ہیں وہ سرکاری ہیں　　جتنے کالج ہیں بہت بھاری ہیں
جیل خانے ہیں سزا دینے کو　　اور خزانے ہیں جزا دینے کو
ہندوؤں کے ہیں دھرم شالے بھی　　مسجدیں بھی ہیں خدا والے بھی
اور ٹکسال و شفا خانے بھی　　ہاں کلیسا بھی ہیں بت خانے بھی
تجھ میں ہوٹل بھی ہیں میخانے بھی　　جن میں شیشے بھی ہیں پیمانے بھی
بمو بازوں کے مدک خانے ہیں　　سارے دنیا ہی کے افسانے ہیں
پادری سیکڑوں صدہا گرجا　　دیویوں میں ہے ہمیشہ پوجا
چھاؤنی فوج کی ہے چھائی جدا　　اور ہے خلق تماشائی جدا
فیکٹریز اور پرس ہیں بہتر　　خفیہ پولس بھی ہے بے خوف و خطر
پلٹنیں اور رسالے ہیں جدا　　توپ خانے ہیں برائے اعدا
پہرے پولس کے نگہبان ترے　　اور گورنر بھی ہیں مہمان ترے
اک طرف کوہ ہیں ٹیلے سرجا　　اور سمر ہوز بھی اور ہے دریا
ہے سمندر بھی فدائی تیرا　　کشتیاں پھرتی ہیں اس میں سرِ حبا
آگبوٹ اور جہازِ جنگی　　مجھ سے تعریف ہو کیوں کر ان کی
نا خدا جتنے ہیں سب خانہ بدوش　　سو بحر جن میں شجاعت کا جوش

مستعد کاموں میں اپنے ہی فوج　　اس لئے بخت کو اُن کے ہی اوج
تار برقی کا نرالا ہے کام　　اور ٹیلیفوں سے ہی سب کو آرام
راستوں پر ہیں جو موٹر چلتے　　گاڑی گھوڑے کے ہیں چھوٹے چھکے
کہیں سردابہ رہا کرتے ہیں　　اور بیوپار ہوا کرتے ہیں
فوج کی روز ڈرل ہوتی ہے　　کبھی غافل وہ نہیں سوتی ہے
کہیں کرکٹ کہیں ٹینس فٹ بال　　کوئی مفلس نہیں سب مالا مال
شرط گھوڑوں کی ہوا کرتی ہے　　فوجی کرتب کی انھیں یاد ہی کی
ہے ہر اک قوم کی مخلوق وہاں　　اور حسیں سیکڑوں معشوق وہاں
ہیں جو ہز ہائینس آغا خاں وہاں　　وہ بھی اِک قوم کے اعلیٰ ہیں نشاں
ہیں جواں بخت بہادر باخیر　　کرتے ہر وقت ولایت کی ہیں سیر
میمن اور بھاٹئے بھورے باہن　　اور ولیوں کے وہاں ہیں مدفن
مارواڑی بھی ہیں تجار بھی ہیں　　مومن اور صاحبِ نتّار بھی ہیں
کنگ کی ساری رعایا خوشحال　　ہیں جواں بخت تو ہیں با اقبال
ختم ہے ان پہ عدالت بخدا　　دوست دشمن کو ہیں رکھتے یکجا
باگ بکری میں ہے الفت ایسی　　اُن میں ہوتی نہیں ہے جنگ کبھی
کچھ تعصب کا نہیں نام یہاں　　بادشاہوں کو یہی ہے شایاں
گاڑیاں چلتی ہیں موٹر بھی ہیں　　اور گھوڑے پری پیکر بھی ہیں

علما اور ہنرمند بھی ہیں — اہل ایران و سمرقند بھی ہیں
کہتے ہیں جس کو اپالو بندر — وہ بھی ہے حسن کا اُس کے زیور
شام کے وقت کا پیارا منظر — دیکھ کر ہوتے ہیں سارے ششدر
جگمگاتا روز پری رویوں کا — ہوتا ہے خلد کا اکثر دھوکا
نازنیں کوئی تو کوئی ہے حسیں — کوئی کمسن ہے کوئی ماہ جبیں
کوئی تو گھوڑے سوار آتی ہے — جس طرح بادِ بہار آتی ہے
کوئی یکہ پہ ہے جوڑی پہ کوئی — کوئی موٹر کی ہے شوفر اچھی
ساتھ ہر اک کے ہے خاوند اُس کا — ہاں لگا رکھا ہے توشہ اپنا
سیر کرتی ہے کوئی ہوٹل کی — کوئی سڑکوں پہ ہے پیادہ چلتی
نظر آتی ہے خریدار کوئی — اور ہے یوسفِ بازار کوئی
کرتی ہے شباب کا کوئی سودا — اور کسی پہ ہے کوئی دل سے فدا
بچھڑے ہر روز ملا کرتے ہیں — وصل کی دل سے دعا کرتے ہیں
شام کی دھوپ وہ پیلی پیلی — سطحِ دریا کے کناروں سے لگی
کرنیں نرم ہیں شرمائی ہوئی — در و دیوار پہ ہیں چھائی ہوئی
مہر کا رنگ خبر دیتا ہے — کسی معشوق پہ یہ مرتا ہے
جستجو کرکے بہت چار پہر — غرب کی سمت وہ کرتا ہے سفر
جا کے آرام کرے گا شب بھر — اور نکلے گا بصد شان قمر

ساتھ تاروں کی رہیں گی افواج — اور پروانوں کا ہوگا پھر راج
شمع محفل کو کرے گی روشن — ہوں گے ہشیار ڈکیت اور رہزن
شام ہوتے ہی ہوا طور جُدا — ٹھاٹھ سب جم گیا کچھ اور نیا
جمع حوروں کے پرے ہونے لگے — اور جواں مرد نکیلے بانکے
ہوٹلوں کی کھُلی شب میں قسمت — جمع ہونے لگے اہلِ دولت
بینڈ بجنے لگی اب خوش آواز — خوش گلو گانے لگے باصد ناز
روشنی ہونے لگی سب برقی — آرزو پوری ہوئی سب دل کی
راگ مایوں کی صدائیں دلکش — میکشی کر رہی ہیں سب مے کش
کوئی اٹھلاتی ہوئی آتی ہے — اور کوئی ناچتی اور گاتی ہے
گنجفہ بازی میں مصروف کوئی — کھیلتا ہے کوئی بلیرڈ اچھی
کوئی ہے حسن پہ اپنے مغرور — کوئی ہے بادۂ الفت میں چور
کوئی باتوں میں ہے مصروف تمام — کوئی بیٹھی ہوئی بالائے بام
کوئی اخبار پڑھا کرتی ہے — کوئی پوشاک سیا کرتی ہے
زاہدہ کوئی، کوئی ہے مے خوار — کوئی خوش باش تو کوئی نادار
مرد بھی بیٹھے ہیں سب مل جل کر — دل لگی کرتے ہیں بیخوف وخطر
وسکی اور سوڈا کوئی پیتا ہے — کوئی جوڑی تو کوئی تنہا ہے
کہیں ورزش کے مہیا سامان — کہیں کُشتی کے ہیں عہد و پیمان

بمبئی ہے کہ ہے رشکِ جنت
ہر طرح سب کو میسر راحت

ہے اگر عیب تو یہ ہی اس میں
کرتے ہیں اُس سے خبردار تمھیں

یہ دغا باز ہے قطّامہ ہے
بڑی دلّالہ ہے علّامہ ہے

نوجوانوں پہ ہی یہ دل سے فدا
اس کی طینت میں نہیں کچھ بھی وفا

خواہ مفلس ہو کہ ہو دولت مند
اُس کو آ جاتا ہے ہر ایک پسند

ناز کرتی ہے لُبھا لیتی ہے
جو کوئی آئے لگا لیتی ہے

ایسی بن ٹھن کے وہ ہوتی ہی جواں
دیکھ کر ہوتا ہے ہر اک قرباں

نذر کرتا ہے کمائی اپنی
سوچتا کب ہے بھلائی اپنی

اُس کا جو کوئی کہ شیدائی ہے
اُس نے اچھی ہی سزا پائی ہے

نوجوانوں کے لئے ہی قاتل
اِس پر آئے نہ کسی کا کبھی دل

جان کر جو کوئی دے جان اس پر
وہ نکلتا ہے وہاں سے مر کر

جو غنی جائے وہ مفلس ہو جائے
اپنی کرنی کی سزا اچھی پائے

مے کشی سے نہیں بچتا کوئی
جو گیا فسق کی اُس کو سوجھی

دام میں جو کوئی اک بار آیا
آخرش جان سے جا کر چھوٹا

جان کا جانا تو آساں ہی وہاں
ہو کے رہتا ہے تصدق ایماں

مے کشی اور زنا کاری ہے
تو یہ تو یہ وہ گنہگاری ہے

گلی کوچوں میں پڑے پھرتے ہیں
ایک پر ایک سبھی گرتے ہیں

کسبیاں کیا ہیں چڑیلیں ہیں سب ‌ ‌ داؤ دینے کے بہت یاد ہیں ڈھب
گانٹھ سے پیسے اڑا لیتی ہیں ‌ ‌ لے کے دل آنکھ چرا لیتی ہیں
جب گئے شاپ میں منھ بھر آیا ‌ ‌ سیکڑوں اور ہزاروں کھویا
مارکٹ سے کوئی خالی نہ پھرا ‌ ‌ خوب جی بھر کے کیا واں سودا
پھنس گیا جاکے جو ٹھیٹر میں کوئی ‌ ‌ چاہتا کب ہو ہٹے واں سے جی
بال میں جاکے لیا سر پہ وبال ‌ ‌ سر سے لے تا بہ قدم کھنچ گئی کھال
الغرض دل سے مری ہے یہ دعا ‌ ‌ نوجوانوں کو بچائے مولی
دام میں اس کے نہ آئے کوئی ‌ ‌ اس سے یاں دل نہ لگائے کوئی
سیر کے واسطے صرف اچھی ہے ‌ ‌ ورنہ یہ صاعقہ ہے بجلی ہے

پند کرتے رہو دل شاد رہو
شاد زندہ رہو آباد رہو

۱۷- جون سنہ ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۲- امرداد سنہ ۱۳۲۲ف	آج معمولی سیر و تفریح کے سوا کوئی نیا کام نہیں ہوا۔
۱۸- جون سنہ ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۳- امرداد سنہ ۱۳۲۲ف	آج بھی کل کی طرح معمولی ملاقاتوں اور سیر و تفریح اور شاپنگ کے سوا کوئی نیا کام نہیں ہوا۔
۱۹- جون سنہ ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۴- امرداد سنہ ۱۳۲۲ف	آج میں نے اپنے بچوں کو تاج محل ہوٹل کے اُس حصّہ میں جو میری سکونت کے لئے مقرر کر لیا گیا تھا لیجا کر دکھایا۔ ایک

رُباعی اِس تاج محل کی تعریف میں موزوں کی جو درج ذیل ہی۔

رُباعی

کیا خوب مقام شاد ہی یہ تاج محل   اعلیٰ منزل ہے شان اس کی افضل
حاصل ہی ہر اک طرح کا اس میں آرام   جنّت تو نہیں، مگر ہے اچھا ہوٹل

۲۰۔جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۵۔امرداد ۱۳۲۲ف — محلات اور بچوں کو بمبئی کے بعض مقامات کی سیر کرائی حضرت پیر ابراہیم صاحب بغدادی غریب خانہ پر تشریف لائے تھے برخوردار عثمان پرشاد اور بچوں پر دعا دم کرکے واپس ہوئے۔

۲۱۔جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۶۔امرداد ۱۳۲۲ف — آج میں ۹ بجے صبح کے مع اپنے چند مصاحبین اور سکرٹری کے پیر محمد ابراہیم صاحب بغدادی کی ملاقات کو گیا جن کا اوپر ذکر آچکا ہی۔بہت دیر تک تصوف و توحید باری تعالیٰ میں اُن سی بحث ہوتی رہی صاحب نظر ہیں میرے ہر سوال کا جواب تسلّی بخش دیا۔علاوہ اس کے ملکی معاملات اور سلطنتوں کے کے انتظامات پر بھی تنقیدی نظر ڈالنے میں اُن کی قابلیت کا ثبوت ملتا ہی۔حضرت کے برادر نسبتی سیّد جمال الدین قادری بھی حضرت کے ہمراہ موجود تھے اُن سے ملاقات ہوئی یہ صاحب بھی جوانِ صالح اور قابل ہیں۔حال میں حضور پُر نور خلد اللہ ملکہٗ نے آپ کو اپنی خزانے سے ماہانہ ایک ہزار مقرر فرمادیا ہی۔ایک بجے اُن سی رخصت ہوکر کوٹھی کو واپس گیا۔

۲۲۔جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۷۔امرداد ۱۳۲۲ف — سوائے معمولی سیر و تفریح و جوابات تار و خطوط کے کوئی نیا کام نہیں ہوا۔

۲۳ - جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۸ - امرداد ۱۳۲۲ف

دن بھر معمولی کاموں کے سوا کوئی کام نہیں ہوا۔ شب کے ساڑھے دس بجے بمبئی سے اجمیر شریف کو روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر بمبئی کے بہت سے احباب موجود تھے اُن سب کو خدا حافظ کہا۔

۲۴ - جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۹ - امرداد ۱۳۲۲ف

شب بھر میں اپنے سیلون میں آرام سے سویا کیا صبح کا ناشتہ ریل ہی میں کیا - ۲ بجے ہماری گاڑی آبو روڈ پر پہونچی - میں نے اپنے ساتوں ڈبّے جو رزرو ڈ تھے علحدہ کرا کر کھانے کی تیاری کا حکم دیا۔ شب کے گیارہ بجے تک وہاں رہ کر روانہ ہونے والی ٹرین میں گیارہ بجے اجمیر شریف کو روانہ ہوا - یہاں کا اسٹیشن ماسٹر نہایت خلیق اور شریف آدمی ہے اُس نے خبر دی کہ مہاراجہ بیکانیر بھی چند روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں - اور میرے آنے کی بھی ہز ہائنس کو خبر معلوم ہوئی ہے - اس لئے میں نے اُس سے کہہ دیا کہ ہز ہائنس مہاراجہ بیکانیر جس روز واپس ہوں میرا سلام و نیاز پہونچا دیا جائے۔

۲۵ - جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۰ - امرداد ۱۳۲۲ف

صبح کے ۷ بجے گاڑی اجمیر شریف پہونچی - چونکہ بہ مقابلہ پہلے کے اب میرے اسٹاف میں تقریباً ڈیڑھ سو آدمی تھے اس لئے عبدالکریم تحصیلدار نے (جن کو میں اجمیر شریف میں چھوڑ گیا تھا) زنانہ اسٹاف کے لئے سیٹھ سمیرمل کی دو کوٹھیاں اور اُس کے قریب ایک اور مکان کرایہ پر لے رکھا تھا - ایک کوٹھی محاذی صدر پتّھر خانہ اجمیر جس میں پہلے آ کر میں رہا تھا وہ اپنے دامادوں اور بیٹیوں کے لئے نامزد کر دی اور ایک اُس سے

کسی قدر فاصلہ پر قریب پوسٹ آفس واقع تھی اُس میں زنانہ کو اُتروادیا اور میں اُسی کے محاذی ایک چھوٹا سا مکان جو لیا گیا تھا اُس میں اُتر گیا۔ معمولی کاموں اور جوابات تار و خطوط کے سوا اور کوئی نیا کام نہیں ہوا۔

۲۶۔ جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۱۔ امرداد ۱۳۲۲ف

معمولی کاموں اور ملاقات کے سوا دن بھر کوئی کام نیا نہیں ہوا۔ درگاہ شریف میں دیگ کی تیاری کا حکم دیا۔ اس کے قبل بمبئی جانے سے پہلے ایک دیگ کرچکا تھا شب کو قوالی کے جلسے میں گیا اور زیارت سے مُشرف ہو کر واپس آیا اور سو گیا۔ آج سید صادق حسین غبار بلدہ سے سوار ہو کر بمبئی ہوتے ہوئے مجھ سے آکر یہاں مل گئے۔

۲۷۔ جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۲۔ امرداد ۱۳۲۲ف

عثمانیہ اسکول کے مینجر آئے اُن سے ملاقات کی۔ دس بجے درگاہ شریف میں اپنے محلات کو لے گیا بعد ادائے نیاز و فاتحہ مَنّت برخوردار عثمان پرشاد طال اللہ عمرہٗ کی پہلی سالگرہ کی گرہ حضرت خواجہ اجمیر شریف کے روضہ میں ڈال دی گئی اور بعد ادائے رسم سالگرہ میں نے بچہ کو حضرت کے دامن میں ڈالدیا عجب حیرت کا مقام ہے کہ جس وقت برخوردار کو حضرت کے دامن میں ڈالا، اُس بچّے نے مزار کی طرف ایسی ٹکٹکی باندھی کہ جیسے کوئی کسی کو دیکھ رہا ہو۔ دس منٹ تک کامل اُس نے اپنا رُخ اُدھر سے دوسری طرف نہیں کیا اور میرا منجھلا لڑکا خواجہ نصر اللہ اس قدر جوشِ مسرت سے اردگرد مزار کے پھرتا تھا گویا اپنے والدین کے اطراف پھرتا ہے اور ہر وقت مجھے اور اپنی ماں کو خواجہ کے مزار کی طرف اشارہ کر کے ہنستا ہوا کہتا کہ (وہ دیکھو) گویا اشارہ کرتا ہے کسی کو

دیکھنے کے لئے اس بچّے کا کہنا دل پر ایسا اثر کر گیا کہ سب کے سب محوِ حیرت ہو گئے دو منٹ تک بیخودی کا عالم رہا۔ وہاں سے واپس ہوا اور شام کو دیوان جی صاحب سے مل کر وہیں سے پھر درگاہ شریف کو چلا گیا شب کو قوالی سُن کر واپس آیا۔

۲۸۔ جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۳۔ امرداد ۱۳۲۲ف — معمولی ملاقاتوں اور جوابات تار و خطوط کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوا۔ دیگ لٹنے کے وقت میں نہیں جا سکا۔ اپنے تحصیلدار عبدالکریم اور سیّد صادق حسین غبار کو بھیجکر سیّد حنیف سے دیگ لٹوائے جانے کا حکم دے دیا اور شام کے پانچ بجے دیرہ دون کی روانگی کا سامان کر کے مع محلات و مصاحبین وغیرہ اسٹیشن پر آیا اور اپنے داماد تارہ چند (بڑے دولھا راجہ) اور اپنی لڑکی اور نواسی کو مع اُن کے اسٹاف کے حیدر آباد کو واپس جانے کی اجازت دی۔ اگرچہ میرا قصد تھا کہ سفر میں اور بچّوں کی طرح اُس کو بھی ساتھ رکھوں مگر لڑکی کی زچگی کا زمانہ قریب تھا اس لئے بلدہ کو بھجوا دینا مناسب خیال کیا۔ اور میں اپنی سیلون و بوگی وغیرہ میں ۵ بجے شام کے روانہ ہوا۔

۲۹۔ جون ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۴۔ امرداد ۱۳۲۲ف — شب بھر اپنے سیلون میں آرام سے سویا کیا صبح کے سات بجے گاڑی ہماری دہلی کے اسٹیشن پر پہونچی۔ میں نے اپنے ڈبے علیحدہ کرا کر اسٹیشن کے ایک طرف قیام کیا۔ ۹ بجے مجھے خبر ملی کہ حضرت خواجہ حسن نظامی چشتی اسٹیشن پر آئے ہوئے ہیں حضرت خواجہ صاحب کو اپنے سیلون تک بلا کر لے آیا اور بچّوں کو دکھایا۔ حضرت خواجہ صاحب نے سب بچّوں پر دعا دم کی اور تھوڑی دیر تشریف رکھ کر اپنے قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شام کے چھ بجے موٹر میں مع محلات دربار محبوب الٰہیؒ میں حاضر ہو کر ۹ بجے وہاں سے

واپس ہوا۔ پھر خواجہ صاحب سے ملا۔ گیارہ بجے شب کے دہلی سے دیرہ دون کو روانہ ہوا۔

۳۰۔جون ۱۹۱۳ء
(مطابق)
۲۵۔امرداد ۱۳۲۲ ف

۷ بجے صبح کے لکسر جنکشن سے دیرہ دون کی گاڑی میں ہمارے ڈبے لگائے گئے اور ۱۰ بجے ہم دیرہ دون پہونچے۔ میں نے اپنے منجھلے داماد میر خورشید علی معروف بہ (دولھا نواب) کو جو دیرہ دون میں امپریل کیڈٹ کور میں تعلیم پاتے ہیں، کوٹھی کے انتظامات کے واسطے بذریعہ تار اطلاع دی تھی اسٹیشن پر پہونچنے کے ایک گھنٹے کے بعد (دولھا نواب) مجھ سے ملے اور میں اُن کو موٹر میں ساتھ لے کر کوٹھی دیکھنے کے لئے گیا۔ کوٹھی دیکھ کر واپس آیا اور تمام محلات اور اسٹاف کو ساتھ لے کر کوٹھی کو چلا گیا۔ یہ کوٹھی دہلی بنک کے متصل ہے۔ دیرہ دون ہردوار سے ۳۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ریل میں جاتے وقت راستے کا نظارہ مُردہ دلوں کے لئے مسیحائی کا کام کرتا ہے۔ جابجا پانی بہ رہا ہے۔ ریل کے دونوں طرف پہاڑ، پہاڑوں پر سبزہ، سبزہ میں رنگ برنگ کے خوشنما پھول قدرت کی سینری کو اُبھار رہے ہیں۔ دامنِ کوہ میں جنگل اس قدر گھنا ہے کہ روزِ روشن میں شبِ یلدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔

دیرہ دون نہایت پُر فضا اور خوشگوار مقام ہے ۱۸۱۴ء تک منصوری اور نینی تال نیپال کی سلطنت میں تھے۔ انگریزوں اور نیپالیوں میں جب لڑائی ہوئی تو انگریزوں کی فتح ہونے پر یہ دونوں مقام سرکار انگریزی کے قبضہ میں آگئے۔ منصوری دیرہ دون سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ہے۔

دیرہ دون بجائے خود ایک دلکش مقام ہے جو خود باعتبار مناظر اپنی مثال

آپ ہی اس کے چاروں طرف سر بہ فلک کشیدہ پہاڑ ہیں جو خودرُو سبزہ سے چھپے ہوئے ہیں۔ دامنِ کوہ میں لکھسر اور ہردوار کے وسط سے ایک جنگل (جس کو عام طور پر جھاڑی کہتے ہیں) شروع ہوا ہے۔ یہ جنگل گردو نواح کے پہاڑوں کو طے کرتا ہوا نینیال کی طرف نکل گیا ہے۔ اور اس قدر گھنا ہے کہ انسان کا گزر تو ایک طرف مرغ نظر کو بھی گنجائش پرواز نہیں ہے۔ ہر قسم کے صحرائی درندوں وگزندوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اس جنگل کو کجلی بن بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے یہاں ہاتھی کا بھی شکار ہوتا ہے راجہ بلرام پور ہر دوسرے تیسرے برس ہاتھیوں کے شکار کو یہاں آتے ہیں اور دس بارہ ہاتھی شکار کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ جنگل شیر، تیندوا، ریچھ، بوربچہ وغیرہ جانوروں کا مسکن ہے۔ اس جنگل میں ہر قسم کی لکڑی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں جس قدر نوادر اشیاء لکڑی کے بنائے جاتے ہیں اکثر وبیشتر وہیں کی لکڑیوں کی ہوتے ہیں۔ ڈیرہ دون میں ایک فارسٹ کالج (مدرسۂ جنگلات) بھی ہے جہاں کے تعلیم یافتہ ہندوستان کے ہر حصے میں ممتاز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہمارے نظام گورنمنٹ میں بھی وہاں کے سند یافتہ موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ برخوردار عثمان پرشاد کی علالت کے باعث میں یہاں کے مشہور مقامات کو دیکھ نہ سکا۔

یکم جولائی سنہ ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۶۔ امرداد سنہ ۱۳۲۲ف	صبح کی دلچسپیوں سے وجود واجب الوجود کا دم بھرتا ہوا اپنے معمولی کاموں میں مصروف ہوا۔
۲۔ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۷۔ امرداد سنہ ۱۳۲۲ف	معمولی کاموں کے سوا کوئی نیا کام نہیں ہوا۔

۳- جولائی سنہ ۱۹۱۳ء
(مطابق) ۲۸- امرداد سنہ ۱۳۲۲ف

آج ایک پارسل خواجہ حسن نظامی صاحب کا بھیجا ہوا دہلی سے پہنچا جس میں کچھ بچّوں کے لئے اُنھوں نے تحفہ روانہ فرمایا تھا۔ آج میں نے رام راؤ خزانچی کو ہردوار جانے اور وہاں مہارانیوں اور نیز ہندو اسٹاف کے قیام کا انتظام کرنے کے لئے حکم دیا اور ایک تار ہز ہائینس مہاراجہ کشمیر کو ان کی کوٹھی کی اجازت حاصل کرنے کے لئے دیا۔ مہاراجہ کشمیر نے یہ کوٹھی گنگا کے کنارے ہر کی پیڑی کے قریب بنائی ہی اور مستورات کے اشنان کے لئے پردہ کی دیوار کھینچکر گنگا کا کچھ حصہ کوٹھی میں لے لیا ہی جس کی وجہ سے عورتوں کو اشنان کرنے کے لئے باہر جانا نہیں پڑتا اور بآسانی اپنے مذہبی فرائض ادا کرسکتی ہیں۔ چونکہ دیرہ دون مُردہ دلوں کی مسیحائی کرنے کا دعوے دار ہی اور اپنے قدرتی مناظر میں اپنی یکتائی کا حریف نہیں رکھتا، علی الخصوص شاعرانہ مذاق کے لئے خیالات میں تازگی و جدّت پیدا کرنے کی ایک قدرتی قوت ہی۔ لہذا اس دل چسپ مقام پر جو کچھ میرے دل و دماغ سے نظم کے پیرایہ میں نکلا اس کو دعوتِ طبع ناظرین روزنامچہ ہذا کے لئے حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ رباعیات اور غزلیات اور بعض اور نظمیں مختلف تاریخوں میں لکھی گئی ہیں، مگر میں نے ان کو صرف دیرہ دون کے قیام میں ایک ہی تاریخ میں لکھ دیا ہی

رباعیات

کیا خوب جگہ ہی شاد یہ دیرہ دون — جس نے دیکھا ہوا وہ دل سے مفتون
اونچے اونچے پہاڑ ہیں کہ جوبن کا اُبھال — سیدھے سیدھے درخت ہیں کہ قدِ موزون

دیگر

ہے کیا ہی بہار اور فضا ہے کیا واہ
وہ کوہ جہاں نہ چڑھ سکے مرغ نگاہ
قدرت کے ہے باغ کا یہ منظر اے شاد
ماشاء اللہ ثم ماشاء اللہ

دیگر

ہے دشت و جبال کا عجب کچھ منظر
ہر رنگ کے گل ہر اک طرح کے ہیں شجر
قدرت کے بھی اے شاد ہیں کیا کیا جلوے
اٹھتی نہیں جس سمت کہ پڑتی ہے نظر

دیگر

ہے کوہ اور شجر میں جلوہ کس کا
اے شاد مرا دل ہے یہ شیدا کس کا
دیکھا جس کو وہی نظر میں آیا
ہے مردم چشم میں تماشا کس کا

دیگر

بچپن میں کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
آیا جو شباب موردِ آفات ہوا
جب پیر ہوا تو پیر کامل ٹھہرا
صد شکر کہ اب پیرِ خرابات ہوا

دیگر

ہر وقت مددگار ہے میرا مولا
ہر حال میں ہے مجھے سہارا اس کا
خالق کو گواہ کر کے کہتا ہوں شاد
اُس کا بندہ ہوں جو ہے نصیری کا خدا

دیگر

عسرت کو مری بس اب تو زائل کر دے
حل بندہ نواز میری مشکل کر دے

مانند ہلال غم سے ناقص ہے شاد — تو مہر سے اپنے بدر کامل کردے

دیگر

مولا مرے اب حل مری مشکل کردے — ناشاد ہے شاد اس کو خوش دل کردے
نکلا ہے زیارتوں کو خالی ہے جیب — بھرپور بس اب دامن سائل کردے

دیگر

کیا حسن کا ہے گرم یہ بازار ترا — ہر کافر و مومن ہے خریدار ترا
سودا ہے گراں شاد ہے تیرا مفلس — کس طرح بھلا اس سے ہو بیوپار ترا

دیگر

ہستی میری جو ہے وہ ہستی تیری — مستی میری جو ہے وہ مستی تیری
تو شخص ہے میں عکس ہوں کچھ فرق نہیں — کیا جنس معرفت ہے سستی تیری

دیگر

مایوس ہوں اب تو کامرانی ہو جائے — ہاں شاد پہ لطف خسروانی ہو جائے
بندہ کو ترے نہیں ہے اب صبر کی تاب — مولا مرے، جلد مہربانی ہو جائے

دیگر

کیا حال سناؤں میں پریشانی ہے — افسانہ مرے درد کا طولانی ہے
سامان خوشی کا ہو مہیا جلدی — تکلیف بہت شاد کو روحانی ہے

دیگر

کیا کفر ہے اور کیا یہ مسلمانی ہے	اے شاد دوئی خطورِ شیطانی ہے
کچھ صوم وصلوٰۃ پر نہیں ہے موقوف	توحید جو ہے یہ وصفِ رحمانی ہے

دیگر

کیسی یہ شراب اور مستی کس کی	تیری ہستی ہے دیکھ ہستی کس کی
کس کا گل اور خار کس کا اے شاد	ویرانہ ہے کس کا تو یہ بستی کس کی

چونکہ طبیعت کو وہاں کے مناظر سے ایک خاص دلچسپی تھی، ایک روز ایک قصیدہ شروع کیا جس کی تشبیب حمد خدائے بیچون وچرا سے کی۔ قصد تھا کہ اس میں ڈیرہ دون کے تمام مناظر کی تصویر کھینچوں لیکن اس قدر وقت مجھے نہ ملا کہ میں اس کو پورا کرتا نا تمام ہی ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

ہے ہر اک شے سے نمایاں قدرتِ پروردگار	دیدۂ دل سے نظر کر ہے اگر تو ہوشیار
کون ان چیزوں کا خالق ہے اسے پہچان لے	کس کے فیضِ آبیاری سے زمیں ہے لالہ زار
کس نے سطحِ آب پر ایسی بچھائی ہے زمیں	اور زمیں پر نصب کی ہے کس نے میخِ کوہسار
کس نے پتھریلی زمیں پر یوں اگائے ہیں درخت	ان درختوں میں کئے ہیں کس نے پیدا برگ و بار
پھول یہ کس نے بنائے کس نے رنگ ان میں بھرا	ایک پتی پھول کی ہے رنگ ہیں لیکن ہزار
کس کی صنعت کا نمونہ ہے یہ گلزارِ جہاں	کس کی یہ گلکاریاں ہیں کس کے یہ نقش و نگار
تحت و فوق و عرش و فرش و نور و ظلمت آب و گل	جن و انس و وحش و طیر و بر و بحر و کوہسار

پست و اوج و انجم و قطب و زمین و آسماں — سال و ماہ و ساعت و مہر و مہ و لیل و نہار
زشت و خوب و حسن و عشق و قبل و بعد و فرد و زوج — ان کا خالق کون ہے کون ان کا ہے آمرزگار
ہیں یہی اشیا دلیلِ دعویِ عرفانِ حق — ہیں یہی اشیا ثبوتِ قدرتِ پروردگار
وہ ہر اک شے میں نہاں ہے اور ہر اک شے میں عیاں — یہ بھی اُس کی شان ہے ظاہر ہیں ہے وہ آشکار
وہ وہ پنہاں ہے کہ ہر پنہاں سے ہے اُس کا ظہور — وہ وہ ظاہر ہے کہ ہر ظاہر ہے اُس کا پردہ دار
وہ ہمارے سامنے ہر چیز میں ہے جلوہ گر — دیکھ چشمِ معرفت سے اس کو اے غفلت شعار
ہے وہ پردہ میں مگر پردہ درِ اسرارِ خلق — اپنا پردہ آپ اُٹھاتا ہے وہ ہو کر آشکار
ظاہر و پنہاں ہے وہ اپنے ارادوں کی طرح — آئینہ بھی ہے وہی اور ہے وہی آئینہ دار
ظاہر اُس کا ہے نہاں اور باطن اس کا ہے عیاں — قدرت اُس کی مستقل ہے صنعت اُس کی استوار
آؤ دیکھیں اس کے دستِ صنع کی گلکاریاں — آؤ دیکھیں گلشنِ قدرت کی اُس کے ہم بہار
کوہ دیرہ دوں کا منظر ہے ہمارے سامنے — کیا مقامِ دل کشا ہے کیا ہوائے خوشگوار
سبز چادر اوڑھے سر سے پا تک استادہ ہیں کوہ — سر اُٹھائے کر رہے ہیں وہ کسی کا انتظار
سبزۂ خود رو نے ڈھانپا ہے تنِ ہر کوہ کو — تازگی جس کی نمائش گاہِ قدرت کی بہار

ترجیع بند بر مطلع اکبر

ہے کیا عروجِ دنیا اور کیا زوالِ دنیا — کیا چیز ہے حکومت، ہے کیا مآلِ دنیا
بدکیش بے وفا ہے، مکّار و پُر دغا ہے — کیا ہے فراقِ دنیا، ہے کیا وصالِ دنیا

شربت ہی دیکھنے کو لیکن ہی سمِ قاتل
معدن فریب کا ہی مال و منالِ دنیا

دھوپ اس کی دوپہر کی گرمی ہی عمر بھر کی
ہی سوءِ ظنِّ عاقل حسن و جمالِ دنیا

مرتے ہیں جو کہ اس پر مُردوں سے ہیں وہ بدتر
آخر اُٹھائیں گے وہ اک دن وبالِ دنیا

جو لوگ ذی خبر ہیں ذی عقل و ذی نظر ہیں
وہ خوب جانتے ہیں کیا ہی مآلِ دنیا

بے اعتبار بھی ہی یہ بے مدار بھی ہی
اے شاؔد چھوڑ دے تو خواب و خیالِ دُنیا

اکبرؔ کا بس یہ مطلع رکھ پیشِ چشم مردم
روشن ہی اس سے بالکل انجام و حالِ دنیا

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہی دنیا کو خوب دیکھا

قطعہ

گرچہ ہیں ہندو مسلماں معترض تو کیا ہوا
کیا میں ہندو ہو گیا کیا میں مسلماں ہو گیا

کہتے ہیں ہندو یہ سارے ہو گیا کھتری بھرشٹ
اور مسلماں کہتے ہیں کافر تھا شیطاں ہو گیا

ہندوؤں میں آریوں کا قولِ فیصل ہی یہی
کھا کے آصف کا نمک ہندو مسلماں ہو گیا

اتنی ہی باتیں ہیں جتنی ہیں زبانیں خلق کی
میرا مذہب کیا ہوا بازیِ طفلاں ہو گیا

واہ اس چشمِ بصیرت کے تصدق جائیے
ان پر کھنے والوں پہ میں دل سے قرباں ہو گیا

کیا محک ہی کیا نظر ہی خوب ہی پرکھا مجھے
داد ایسی دی کہ یہ دل میرا شاداں ہو گیا

ملک و ملت گوشِ دل سے عرض اب سن لے مری
خواہ میں کافر رہا یا میں مسلماں ہو گیا

میرا مشرب صوفیانہ اور ملت صلحِ کل
صورتِ انساں تھا پہلے اب میں انساں ہو گیا

قوم کا کھتری ہوں یعنی صاحبِ سیف و قلم
تھا فقیرِ بینوا لیکن میں ذی شاں ہو گیا

مالکِ طبل و علم ہوں صاحبِ علم و ہنر
کون سے اعزاز میں کب ہم عناں ہو گیا

خادم ہر قوم ہوں اور باہم کہتا ہوں میں
مجھ سے حق سے یہ ازل میں عہد و پیماں ہو گیا

چھوڑیئے مذہب کو میرے مجھ سے خدمت لیجئے
تم سمجھ لو گے کہ ہر اک کام آساں ہو گیا

صلح کل ہوں میں کسی سے کچھ نہیں رکھتا غرض
گو زمانہ دوست ہو کر دشمنِ جاں ہو گیا

میں بُرا ہوں یا بھلا جیسا ہوں اپنے واسطے
کوئی کیوں میرے لئے رنجش کا خواہاں ہو گیا

حضرتِ آصف کے فیضِ تربیت سے شاد میں
ایک ذرّہ تھا مگر مہرِ درخشاں ہو گیا

اتفاق

اتفاقِ قوم اب درکار ہے
یہ نہیں تو زندگی بیکار ہے

خوش ثمر پوچھو تو کیا ہے؟ اتفاق
اس سے ہی سرسبز سرگلزار ہے

اہلِ مغرب کو تو حاصل ہے یہ بات
مشرقی محروم ہیں ادبار ہے

دُور ہو گا ہم سے کب یارِ نفاق
پڑ گیا پیچھے یہ کیا آزار ہے

نقد سودا ان دنوں پوچھو یہی
گرم اسی کا آج کل بازار ہے

ایک عاقل نے کہا یہ قوم سے
اچھّا سودا گر تمھیں درکار ہے ق

بیچتا ہوں سستے داموں اتفاق
ہند بے اس کے بہت نادار ہے

سن کے بولا ایک کیا ہی تیرے پاس — سونے اور روپے کا بھی بیوپار ہی
کیا کریں ہم لیکے تیرا اتفاق — ہم تو ہیں مفلس درم درکار ہی
ہنس کے بولا بھائی کیا افسوس ہی — گر تمھیں دام و درم درکار ہی
اس مرض میں ہو اگر تم مبتلا — وہ بھی حاضر لے مرے سرکار ہی
کہکے اس نے ایک بوتل پیش کی — اور کہا حاضر ہی گر درکار ہی
پیجیے اک گھونٹ اس کا دیکھیے — نام اس کا شربت دینار ہی
ہاں مگر سن لیجے میری ایک بات — آپ کا بندہ یہ تابعدار ہی
آپ ہی کی قوم سے ہی یہ غریب — جان و دل سے آپ کا غمخوار ہی
مفلسی کو جو کہا تم نے مرض — یہ نہیں اصلا مرض سرکار ہی
حق کی جانب سے سزا ہی قوم کو — قدرتی لعنت ہی اور پھٹکار ہی
چھوڑ دو گر آج کے دن تم نفاق — زر سے مالامال سب گھربار ہی
دولتِ عظمیٰ ہی جو ہی اتفاق — پاس جس کے ہوگا یہ سردار ہی
فکر کرکے اس کو حاصل کیجیے — دوسری جو فکر ہی بیکار ہی
ہو جو آپس میں تمھارے اتفاق — وہ ہی دھن دولت کا پھر مختار ہی
قوم کی عزت کا اس پر حصر ہی — یہ ہی طرّہ زینتِ دستار ہی
ملک کو تسخیر کرلوگے ابھی — یہ تمھارا مونس و غمخوار ہی
آئے گا دشمن نہ غالب آپ پر — ایسی جو سر دار یہ تلوار ہی

گنجِ قاروں سچ جو پوچھو ہی | قدر اس کی جو کرے اوتار ہے
جو کوئی اس مے کا پی لے ایک گھونٹ | وہ بہت زیرک ہے اور ہشیار ہے
کیجئے میری نصیحت کو قبول | یہ اگر نعمت تمھیں درکار ہے
مفت دیتا ہوں تمھیں لے لو اسے | یہ بڑی دولت مرے سرکار ہے
لیجئے اور دیجئے ہر دوست کو | ملک کو اس وقت یہ درکار ہے

شاد رکھے گا خدا دارین میں
یہ دعا میری جو ہی اسرار ہے

غزل

مادرِ گیتی سے جب پیر و جواں پیدا ہوئے | دھوم تھی دو دن کی خاطر میہماں پیدا ہوئے
حکم اس کا نام ہے قدرت اسے کہتے ہیں سب | کن کے کہتے ہی یہ سب کون و مکاں پیدا ہوئے
خاک کے پتلے ہیں لیکن حوصلے رفعت پسند | شان دیکھو اس زمیں سے آسماں پیدا ہوئے
بات کی موسیٰ سے کس نے لن ترانی کیوں کہا | گو مگو کا راز تھا پر راز داں پیدا ہوئے

شاد کیا ہی شادماں تھے خاتمِ پیغمبراں
جب حسینؑ ابنِ علیؑ جانِ جہاں پیدا ہوئے

۴۔ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء
(مطابق) ۲۹۔ امرداد سنہ ۱۳۲۲ ف

آج میں ۷½ بجے کی ٹرین میں مع محلات و ہندو اسٹاف ہردوار کے اشنان کرنے اور مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے روانہ ہوا۔

مہاراجہ کشمیر نے میرے تار کے جواب میں اپنی کوٹھی میں قیام کرنے کی مجھے اجازت دیدی تھی۔ چنانچہ محلات کو اسی میں اتارا گیا۔ بڑی رانی، چھوٹی رانی، والدہ عثمان پرشاد اطال اللہ عمرہٗ اور میری اکثر عزیز مستورات نے کوٹھی کے اندر والے گنگا کے حصّے میں اور میرے اسٹاف کے ہندو مصاحبین وغیرہ نے "ہر کی پیڑی" میں اشنان کیا۔ میں نے بھی ایک غوطہ لگایا۔

یہ شہر یا قصبہ جسے ہردوار کہتے ہیں، گنگا کے کنارے پہلا شہر اور یہ ہندوؤں کا بہت پرانا مشہور تیرتھ ہے۔

یہاں کے تمدنی حالات اور روزمرہ کے واقعات لکھنے میں مجھے خوف ہے کہ میرے ہندو بھائی اعتراضات کا نشانہ نہ بنائیں۔ مگر کچھ حالات لکھتا ہوں۔ ریل سے اترتے ہی پنڈوں کے غول جاتریوں کو آگھیرتے ہیں اور ہر ایک سے یہی پوچھتے ہیں کہ آپ کہاں سے آئے اور آپ کا پنڈا کون ہے جاتری جواب دیتے دیتے عاجز آجاتے ہیں کیونکہ ایک غریب جاتری کے اوپر ہزاروں پنڈوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ آخر جب تک وہ ہر ایک سے اپنے پنڈے کا نام نہ بتلادے یا انھیں میں سے کسی کو اپنے ہمراہ نہ لے چھٹکارہ محال ہوتا ہے۔ اب تھوڑے دن سے بہت آدمی یہ کہکر البتہ بچ جاتے ہیں کہ ہم تو آریہ ہیں اور گوروکل دیکھنے آئے ہیں۔ گوروکل کے نام سے تو اُن کے پتنگے ہی لگ جاتے ہیں۔ یہ پنڈے دن نکلتے ہی بعض ریل میں اور بعض پیدل ہردوار میں آداخل ہوتے ہیں اور غروب آفتاب کے

قبل یا کچھ بعد جوالاپور یا کنکھل وغیرہ میں جو ہردوار کے مضافات میں واقع ہیں چلے جاتے ہیں۔ اس کا سبب علّام الغیوب ہی جانتا ہے۔ بعض لوگوں کے اس کا سبب پوچھنے پر بعض نے جواب دیا کہ یہ لوگ دن بھر میں جاتریوں سے اچھی خاصی رقم وصول کر لیتے ہیں اور اس کو ناجائز اور برے کاموں میں صرف کرتے ہیں اور بہت سے ان میں بام مارگی بھی ہوتے ہیں لہذا جس گنگا پر کماتے ہیں اسی پر گناہ کرنا زیادہ معیوب سمجھکر رات کو یہاں نہیں رہتے۔ نیز یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ گنگا ماتا ناراض ہو کر کہیں سراپ نہ دیدے۔ کوئی کہتا تھا کہ انھیں گنگا کا سراپ ہے کہ رات کو میرے کنارے نہ رہو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ مگر ایک پنڈے سے کسی نے پوچھا اس نے ایک معقول جواب دیا اس نے کہا کہ ہم بھی گرہستی ہیں۔ بیوی بچے سب ہی کچھ رکھتے ہیں۔ ہم جس گنگا کا دان کھاتے ہیں اس کے استھان پر رہکر بھوگ بلاس نہیں کرتے۔ دوسرے ہردوار جیسی تنگ جگہ میں اتنے لوگوں کے رہنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں پنڈوں کی تعداد چار پانچ ہزار کے قریب قریب ہے یہ سب جاتریوں کی بدولت اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ جب کوئی جاتری ان سے دق ہو کر کہتا ہے کہ بھائی جاؤ محنت مشقت کرکے کھاؤ۔ ناحق لوگوں کو نہ ستاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہم سے محنت نہیں ہوتی۔ ہمارے باپ دادا نے کبھی محنت یا نوکری نہیں کی ہم تو گنگا مائی کے نوکر ہیں اسی کی ٹہل کرکے کھاتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ یہ گنگا مائی کی کون سی ٹہل کرتے ہیں۔ گھاٹ چندے سے بنے ہوئے ہیں صفائی وغیرہ کا سب

انتظام سرکار کی طرف سے ہوتا ہے۔

سرکار ہی نے ہر کی پیڑیوں کے آگے جو تعداد میں پچیس ہیں گھاٹ بنوا دیئے ہیں۔ دریا کی تہ میں پکّا فرش لگوایا ہے اور بند باندھ کر پانی قابو میں کر کے لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا ہے۔ پنڈوں نے تو یوں ہی گنگا کو اپنا مال سمجھکر ذریعۂ معاش بنا رکھا ہے بہت سے آدمی ہردوار میں جاکر سونا چاندی اور کپڑا وغیرہ پن کر کے پنڈوں کو دیتے ہیں بہت سے ساہوکاروں اور راجے مہاراجاؤں نے گنگا کے کنارے اور وسط شہر میں مختلف مقامات پر مکانات اور حویلیاں بنوا کر مہنت لوگوں کی نگرانی میں دیدی ہیں کہ جاتری لوگ آرام پائیں اور یہاں بآرام تمام قیام کر کے اپنے مذہبی فرائض بجالائیں مگر یہ لوگ جاتریوں سے اس رقم سے دس میں حصہ زیادہ رقم وصول کر لیتے ہیں جتنی کرایہ میں دے سکتے ہیں اگر موقع ملتا ہے تو جاتریوں کا مال بھی چوری کرا دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض بڑے مالدار ہوتے ہیں اور کئی کئی عورتیں بھی رکھتے ہیں۔

ہردوار گو چھوٹا سا شہر ہے مگر بارونق ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبے و ہر گوشہ سے ہر قوم کے ہندو یہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ اسی لئے ہر روز نئے آدمی نظر آتے ہیں یہاں کا بازار نہ ایسا کشادہ ہے جیسا کہ بڑے بڑے شہروں کا ہوتا ہے، نہ ایسا تنگ ہے جس میں گاڑی گھوڑا نہ جا سکے۔ سڑک کنکر کی ہے۔ یہاں کرایہ کی گاڑیاں بھی ملتی ہیں مگر بناہ بخدا چلتے ہیں سڑک پر ان کی آواز کانوں کے پردوں کو ناقابل برداشت تکلیف دیتی ہے۔ جب گاڑی چلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو طاشہ مرفا بج رہا ہے یا انہد کا باجا۔

یہاں زیادہ تر مالا، کنٹھی، جنیو، دھوتی، انگوچھے، پتھر کی کٹوریاں، اور گنگا جلیوں کی دُکانیں ہیں۔ یہاں سبزی کی افراط ہی اور دُودھ دہی بھی اچّھا ملتا ہی۔

گنگا کا جل نہایت صاف سُتھرا اور ٹھنڈا ہی دریا پر دُور تک پتھر کا پلیٹ فارم بنا ہوا ہی۔ جس پر سیٹھ للتا پرشاد پیلی بھیت والوں کی طرف سے اندھیری راتوں میں روشنی کا قابل تعریف انتظام ہی۔ یوں تو ہر کی پیڑی پر بارہ مہینے ہی رونق اور چہل پہل رہتی ہی، مگر جب کوئی پرب کا دن ہوتا ہی تو زیادہ بھیڑ بھاڑ ہو جاتی ہی اور کنبھ کے میلے پر جو بارہ سال میں ایک دفعہ آتا ہی جاتریوں کی تعداد کئی لاکھ تک پُہنچ جاتی ہی۔ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر کانگڑی میں آریہ سماج کا گروکل ہی۔ یہاں بال برہمچاری بدیا کی تعلیم دی جاتی ہی اور اس کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہی۔ ہردوار کے آس پاس بھیم، گودر، سورج کنڈ، لنگڑا ہنومان، بھیروں، نارائن سلا، منا دیوی مانا دیوی، درگا کا مندر، سرون ناتھ وغیرہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے تیرتھ ہیں اور رکھی کیش جو ہردوار سے قریب ۱۲ میل کے فاصلے پر ہی سب سے عمدہ جگہ ہی یہ ایک چھوٹا سا سرسبز اور شاداب پہاڑ ہی جس پر قسم قسم کی جڑی بوٹیاں ہیں۔ ہزاروں سادھو یہاں درویشانہ باطنی تعلیم پاکر حکومت باطنی کا ڈپلوما حاصل کرتے ہیں اور یہ سلسلہ یہاں سے کوہِ ہمالیہ کے دامن تک مسلسل چلا گیا ہی جس میں ہزاروں ہندو مسلمان درویش فیض باطنی سے کامیاب ہوتے ہیں۔ موسم سرما میں خصوصاً رکھی کیش کے پہاڑ پر سادھوؤں کا بڑا ہجوم رہتا ہی کیونکہ یہ موسم یہاں پر نہایت دلچسپ و پُر فضا ہوتا

ہے۔ برسات میں سُنا جاتا ہے کہ یہاں سانپ بکثرت ہو جاتے ہیں اور بندروں کا تو یہاں اور ہردوار دونوں ہی جگہ ایک عظیم الشان شہر ہے۔ ہردوار و رکھی کیش میں آنے والے جاتریوں کو بہت دق کرتے ہیں۔ دونوں جگہ جاتریوں کے واسطے کئی دھرم شالے بنے ہوئے ہیں۔ رکھی کیش سے ۳ میل آگے لچھمن جھولا ایک بڑی پُر فضا جگہ ہے۔ دریا پر ہلنے والا پل بندھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں تک میں نہ جا سکا۔ راستہ بارش کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا۔ ہردوار اور کنکھل دونوں جگہ گنگا میں دن رات مُردوں کے پھول یا استھ ڈالے جاتے ہیں اور اکثر لوگ ان ہڈیوں میں کچھ چاندی سونا بھی ڈالتے ہیں جسے اول تو اچارج دریا میں ڈالنے سے پہلے ہی نکال لیتے ہیں اور اگر کوئی جلدی کرکے ڈال دیتا ہے۔ تو یہ لوگ چھینکوں سے ہڈیاں نکال کر پانی میں دھو دھو کر بعد میں نکال لیتے ہیں اور دن بھر پانی میں گھسے ہوئے پاؤں سے ہڈیاں مَل مَل کر کچھ نہ کچھ نکالتے ہی رہتے ہیں۔ آہ ان سنگ دلوں کو کبھی بھی یہ خیال نہیں آتا کہ جن کو ہم پاؤں سے روند رہے ہیں معلوم نہیں کہ ان میں کن کن امرا، وزرا، راجہ، مہاراجہ عالم، فاضل، شاعر، مصنف، حکیم، وکیل، جج، امیر، غریب، درویش، صاحب باطن کے استھ ملے ہوئے ہونگے کیا ان کو یہ دوہا بھی نہیں یاد آتا ؎

ماٹی کہے کمہار سوں تو کیا رَوندے موئے
اک دن ایسا ہوئے گا جو میں روندنگی توئے

مستورات جب اپنے مذہبی فرائض سے فارغ ہو چکیں اور میں نے بھی پار کے

جلوے ان آنکھوں سے دیکھ کر آنکھوں کو نور دل کو سرور بخشتا تو مع چھوٹی رانی اور بیگمات کے دیرہ دون کو واپس ہوا۔ بڑی رانی اور اپنی نانی صاحبہ کو اس لئے وہاں چھوڑ آیا کہ بڑی رانی کی طرف سے جو برہم بھوج اور بھنڈارہ سادھواں کا ہونے والا تھا نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ بعض لوگوں نے مجھے بلحاظ مذہبی فرائض کے وہاں رہنے کو کہا مگر میں بمصداق ~

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

دیرہ دون کو واپس چلا آیا اور ان سے دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا۔

رانیوں (نیز مستورات) نے اسی کوٹھی میں قیام کیا۔

۵۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۳۰۔ امرداد ۱۳۲۲ف صبح کو چھوٹی حاضری سے فارغ ہو کر سید صادق حسین غبار اور رامچندر پرشاد کو ہمراہ لے کر اسٹیشن پر آیا اور وہاں سے پھر ہردوار میں آکر کوٹھی میں پہنچا۔ چونکہ ہردوار کے تمام سادھوؤں کو آج بھنڈارہ دیا جانے والا تھا، اس لئے میں کنکھل چھوٹے اکھاڑے میں گیا۔ ہندو اسٹاف میرے ساتھ تھا۔ آج چھوٹے بڑے اکھاڑوں کے سادھوؤں اور مہنتوں کی دعوت کے علاوہ (۲۵) مہر انگریزی اور چھ جوڑ دوشالے اور (۵۰۰) روپے مختلف مہنتوں اور سادھوؤں کو دیئے گئے۔ بعض مہنتوں سے جو امرتسر سے آئے ہوئے تھے ملاقات کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر بہاری لال کھتری کے مکان کو گیا جہاں جگناتھ پرشاد ساکن جگادھری سے ملاقات ہوئی۔ "بڑے اکھاڑے" کے بھی درشن کئے یہاں کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ البتہ "چھوٹے اکھاڑے" کا انتظام نہایت سلیقہ کے ساتھ ہے۔ وہاں کے مہنت جاتریوں کے اداشناس منکسر، ہوشیار اور محنتی شخص ہیں۔ چونکہ وقت تنگ تھا اس لئے

رانیوں اور نیز تمام ہندو اسٹاف کو اسٹیشن پر آجانے کا حکم بھیجکر میں اسٹیشن کو واپس ہوا۔ اور اسٹیشن پر دو تصویریں واٹر کلر کی پینٹ کیں اور ۳ بجے کی گاڑی میں سب کچھ ساتھ لے کر ۵ بجے دیرہ دون میں داخل ہوا۔

۶۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق ۳۱۔ امرداد ۱۳۲۲ف) آج میں بہت سویرے خواب سے بیدار ہوا۔ صبح کا سہانا سماں پہاڑوں کا دلچسپ نظارہ اور اس کی سینیریوں سے دلچسپی حاصل کر رہا تھا۔ چند حصّوں کو واٹر کلر میں پینٹ کیا۔ صناع قدرت کی گل کاریوں اور کرشمہ کاریوں کو دیدۂ دل سے دیکھ رہا تھا کہ ہردوار کا خیال آگیا۔ ع

سمندِ شوق پر اک اور تازیانہ ہوا

ایک مضمون لکھا جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

ہَرڈُوار

مکّے میں ہردوار میں تو ہی ہے — اور نور میں اور نار میں تو ہی ہے

دونوں عالم میں ہے نظارہ تیرا — ہر ہر گھٹ ہردوار میں تو ہی ہے

اے ہردوار تجھے پرنام ہے، یا یہ کہوں کہ سلام ہے۔ میرے اس عقیدتمندانہ تحفہ کو قبول کر۔ بہت دنوں سے تیرے درشنوں کو من ترستا تھا بڑی ابلاکھا تھی۔ اے ہردوار تو ازلی مقدس مقام ہے۔ تقدّس اور بزرگی کا سہرا ابتدا سے قدرت کے ہاتھوں سے تیرے سر پر باندھا گیا ہے مگر بھاگیرتی کی بدولت تیری برکتیں مشک

کی طرح تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تیرے جاترائی تیرے درشن سے مُبارک اور کامیابی کے شگون پاتے ہیں چاروں برنوں کو تجھ سے دلی عقیدت اور محبّت اور اپنایت ہی۔ دشتِ غربت کے مسافر تیری زمین پر ہی چھاؤنی چھاتے ہیں۔ بڑے بڑے رشیوں نے گھنے اور کوہی جنگل میں دُھونی رما کر تیری سرزمین پر اپنی عمریں بسر کیں اور ان کی خاک تجھ میں ملادی گئی۔ بڑے بڑے چکرورتی مہاراجے اپنی مُکتی کی اُمید میں تیرے دُوار پر بھکاری بنکر پڑے رہی اور دان پُن کے ذریعے سے بہت کچھ تجھے بھینٹ چڑھائی اور تیرے کارن جو کچھ اُن سے بن سکا اس کو کیا تجھکو گنگا مائی کا شکر گذار ہونا چاہیئے اور اُس کی جَے منانی چاہیئے جس کے کارن کئی جگ سے اِس جگ میں مان پان ہو رہا ہی۔ اخاّہ! بھاگیرتی کو دیکھو کہ وشنو لوک یعنی ہر کے دُوار سے اِس کو اجازت ملی ہی کہ اِس سرزمین سے بہتے ہوئے اپنے معبد سے جا کر ملے اِس لیے اِس سرزمین کا نام ہر دُوار رکھا گیا ہی۔ اُس پرماتما کا کتنا بڑا احسان اور کرم ہی کہ ایک عُنصر آبی کو وہ شرف اور عزّت بخشی کہ ایک مقدس قوم بنی آدم سے اِس کی پرستش کرتی چلی آتی ہے اور کرتی جائے گی۔

اگرچہ اِس کے پانی کی حقیقت اور دوسرے دریا، کنوؤں کی ماہیت بالکل ایک ہی مگر اُس کو وہ شرف ملا ہی جو اُس کے ہمعصروں کو نصیب نہیں اِس سے نہ صرف زراعت ہوتی ہی اور نہ ہی نوع انسان کے سوکھے حلق تر ہوتے ہیں بلکہ وہ درخت فیضیاب ہوکر شاداب ہوتے ہیں جو اِس کے کنارے ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے کوئی ایک صدی

کوئی نصف صدی کوئی ربع صدی سے نرانکار جوتی سروپ کے دھیان میں اس قدر محو
ہوگئے ہیں کہ ان کو اصلا اپنی خبر نہیں۔ ہاں کبھی کبھی ہوا کا جھونکا ان کو ہوشیار کر دیتا ہے
تو یہ چونک کر خدا کی یاد میں جھومنے لگتے ہیں۔ دامنِ کوہ میں ایک گھنا جنگل پناہ گزین ہے
اور چھوٹے پودے بچوں کی طرح ان پہاڑوں کی گود میں ہوا سے کھیلا کرتے ہیں اگرچہ
ان کو بھاگیرتی کے فیضِ جاریہ سے ایک چلو بھی پانی نہیں ملتا لیکن قدرت کا ابرِ کرم ہر وقت
ان کی پرورش کی خبر لیتا ہے۔ ان کی شان اور آن بان اور ہی ہے گو ان میں سے
بعض نے لبِ دریا اپنا مسکن بنایا ہے۔ مگر دریا کا ان پر کوئی احسان نہیں، نہ یہ دریا سے
کبھی ملاقات کرتے ہیں، نہ اس کی مقدس برکتوں سے انھیں کچھ نفع پہونچتا ہے، نہ دریا
(بھاگیرتی) کو ان سے کچھ غرض ہے، مگر ہاں ان میں سے بعض درختوں اور پہاڑوں کا
عکس (بھاگیرتی) کے درپن میں اپنی بے نیازی کی شان دکھا کر عالم کو محوِ حیرت کر دیتے
ہیں۔ اے گنگا مائی تیری خاطر کیسے دلوں کے ساتھ وابستہ ہے کہ تیرے کنارے بڑے
بڑے راجے مہاراجوں نے عالیشان مکان اور چھتر اور دیول بنوا کر تیری رونق کو دوبالا
کر دیا۔ اے گنگا مائی دھن ہے تیری عاجزی اور انکساری پر کہ باوجود اس قدر معزز
اور محبوبِ خلائق اور شدھ ہونے کے تجھ میں دوئی کی بو بھی نہیں۔ تعصب کا نام نہیں
تیرا مذہب صلح کل، خدا پر تیرا توکل۔ ہر کس و ناکس دوست و دشمن۔ برہمن چھتری۔ ویش
شودر سب کو تو درشن دیتی ہے۔ اور سب کو ایکساں فیض پہونچاتی ہے۔ اور سب کے
لیے منوکامنا پوری کرتی ہے۔ نہ صرف یہی کہ بلاقید ملت و مذہب تیری ذات سے تشنگانِ

محبّت اور عقیدت سیراب ہوتے ہیں بلکہ وہ تجھ میں میلے کچیلے کپڑے دھوتے ہیں اور چرنامرت بنانے کے عوض دوسرے بیجا کاموں میں بھی صرف کرتے ہیں لیکن تیرا دل ایسا پاک و صاف ہی اور تو وہ پکّی موحد اور بے تعصّب ہی کہ بجز ان کو نفع پہنچانے کے تو ان کی بُرائیوں کے تدارک کا خیال بھی نہیں کرتی۔ ہاں بیشک یہ اوصاف تجھ میں ایسے پاکیزہ اور ستودہ ہیں کہ ہم تجھے پرنام کرتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں اَچھون کرتے ہیں۔ مہادیو کو ابھیشیک تجھ سے کرتے ہیں۔ مگر یہ تو بتا کہ کیا تجھ میں بھی شکتی ہی کہ تو پاپوں کے مَیل کو ایسا دھو دیتی ہی جس طرح کپڑے کے میل کو پاک و صاف کرتی ہی۔ کیا یہ ست مانا جائے کہ جو تجھ میں اشنان کرتا ہی وہ مکتی کو پراپت ہوتا ہی۔ اگر سچ ہے تو یہ اوصاف تجھ میں کب سے آگئے ہیں کیا اس کا جواب نہیں ملے گا۔ ہاں نہیں ملے گا۔ کیوں کہ یہ اپنی دُھن کی ایسی پکّی اور اپنے دھیان میں ایسی مستغرق ہی کہ بجز یادِ الٰہی کے یہ کبھی کسی کی طرف متوجہ نہ ہوگی۔ اس سے ہرگز جوابِ باصواب کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے۔ اِس لئے اُے گنگا مائی یہ عوض اس کے کہ میں عامیوں کی طرح روپے پیسے پھول پھل وغیرہ تیری بھینٹ اور نویدچڑھاؤں میں اپنے دلی جذبات اور خیالات ان کے معاوضہ میں تیری بھینٹ کرتا ہوں خواہ تو اس کو قبول کر یا نہ کر۔ مگر ہاں میں جانتا ہوں کہ تو ایسی رحمدل اور بھگتوں کی محب ہی کہ تو ضرور میری اس ناچیز بھینٹ یا نذر کو قبول کرے گی۔

میں پہلے اُس پرما تما نرانکار جوتی سروپ کو نمشکار یا سجدہ کرتا ہوں جوالکھ ہی

اور جس کی شان یہ ہی نربھو نرویراکال مورت اور تعینات جسّی سے مُنزّہ اور مُبّرا ہی اور ایک ذات تعین اور ہست مطلق سب سے اعلیٰ نہایت پاک قدیم پیدایش وفنا سے آزاد اور محیط ہی اور سرب بیاپکی ہی اور سب سے نیارا کل کائنات فنا ہوجائے گی مگر اُس کی ذات ویسی ہی قائم اور برقرار رہے گی اور جس نے سارے کائنات کو تماشا گاہ قدرت بنا کر آدم سے لے کر تا ایں دم سب کو محو حیرت بنا دیا ہی، اُسی کی قدرت نے یہ عزت عطا فرمائی ہی۔ میں بہت دنوں سے تیرا نام سُنتا تھا بمصداق ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد

بسا کیں دولت از گفتار خیزد

آج میں تیرے اشنان کے لئے آیا ہوں اور تیرے درشن سے آنکھوں کو روشن کرنا چاہتا ہوں مگر اے بھاگیرتی میں تجھے صرف گنگا سمجھکر پرنام نہیں کرتا بلکہ تجھے اُس کا سروپ سمجھکر پرنام کرتا ہوں جس کی تو مظہر ہی اور جس کے جلوۂ قدرت کا ایک ظہور ہی۔ تجھکو میں اِس لئے مقدّس سمجھتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس مہاپرشوں نے جنھوں نے اپنے کو اُس کی ذات میں فنا کردیا تیرا اشنان کرکے اپنے پاک روحانی اثر سے تجھکو مقدّس بنایا ہی تجھے میں دراصل پاپ ناشی نہیں کہتا۔ مگر ہاں جن کے وجود پاپوں سے پاک تھے اور جن کے کرموں کی صفائی اور پاکی دوسروں کے پاپ اور دل کے میل کو صاف کرنے کے لئے صیقل گر سمجھی گئی تھی ان کے پاک وجود کا اثر جو تجھ میں ہی اور رہیگا وہ ضرور میرے دل کے میل کو دُور کرسکے گا

اور مجھکو پاپوں سے نجات دینے کے لئے شافع ہوگا۔

اب میں اس دھیان سے کہ اس کی ذاتِ پاک میں اپنی ہستی کو نیست کرکے اُس کی ہستی کو باقی سمجھکر غوطہ لگاتا ہوں۔ اَب میں اشنان سے فارغ ہوا۔ اب اسی پربھو کا دھیان کرکے گایتری کا جاپ کرتا ہوں جس گایتری کے یہ معنی ہیں۔

ترجمہ پرماتما جو کُل مخلوقات میں جلوہ گر ہے اور پرستش کے قابل ہے اس پیدا کنندہ کا نور سب جانوں میں جلوہ گر ہے۔ ہم فرماں بردار خلوص عقیدت سے یقین کرتے ہیں کہ جو ہمارے حواس خمسہ اور دل اور عقل میں ہیں اُن کو تو اپنی ذات پاک کی طرف رجوع کر۔ اے بھاگیرتی اب میں اپنی جاترا سے فارغ ہوچکا تیری درشن بھی کرلئے اور وحدت کے تماشوں کو اِن آنکھوں سے کثرت کے انوار میں دیکھکر محو حیرت بن گیا ہوں بیشک مجھے اے بھاگیرتی تیرے اشنان کا مزا آیا اور مسرت بے اندازہ حاصل ہوئی۔ سب عقیدت مند تجھکو خالق سمجھکر اپنی مرادیں تجھ سے مانگتے ہیں مگر میں تجھے مخلوق سمجھتا ہوں اس لئے میں تجھ سے کچھ مانگنے کی تمنا نہیں رکھتا البتہ میں تیرے کنارے کھڑے ہوکر اُن مہاتماؤں کو جن کے طفیل میں تجھکو یہ عزت حاصل ہوئی ہے اپنا وسیلہ گردان کر اپنے داتا سے دعا کے الفاظ میں یہ مانگتا ہوں کہ اے پربھو مجھے کمالِ معرفت نصیب کر۔ عرفان کی آنکھ دے۔ عشق کی شراب پلا۔ سر میں توحید کی مستی، دل میں اپنے عشق کا سوز اور سوز میں اثر دے۔ میرے دل کو اس بھاگیرتی

کے شفاف پانی کی طرح دوئی کے میل سے صاف کردے اور میرے پاپوں کو اپنے باران رحمت سے دھو ڈال جس طرح بدری نارائن کے برفستانی پہاڑ کا سرد پانی اس کی اس سوزش غم کو جو مبدء سے مفارقت کے باعث بھڑکی ہوئی ہی فرو کرتی ہی اسی طرح تو اپنے مہر کے فیض سے میرے جلے ہوئے دل کو ٹھنڈک پہونچا اور سیتل کردے اور ماسوی اللہ سے اس طرح پاک وصاف کردے جیسا کہ تونے اس گنگا کو خس وخاشاک سے پاک وصاف کیا ہی مجھ میں لے پربھوا دھنتائی دے جیسا کہ اس دریا کو تونے عطا فرمائی ہی کہ برے بھلے پاپی۔ کنشٹ برہمن۔ چھتری۔ ویش۔ شودر سب کو یہ ایک سمجھتی ہے ایک دیکھتی ہی اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتی ہی۔ ویسے ہی میرا من بھی ہوجائے۔

اے داتا جس طرح اس کو تونے فیض پہونچانے کے لئے پیدا کیا ہی۔ مجھ جیسی ناقص غریب مخلوق سہی تو اپنی مخلوق کی اطاعت لے اور مجھے خدمتگذاری کی عزت دے میں جب تک زندہ ہوں تیری عبادت اور مخلوق کی اطاعت میں فرق نہ سمجھکر ہر وقت ہر دم اس طرح تیری عبادت کروں کہ اپنی ہستی کو تیری ہستی کے نذر کردوں مجھ میں کوہ ہمالیہ کی طرح استقلال دے کہ تیری بلاؤں پر صابر رہکر تیری نعمتوں کا شکر گزار ہوں جس طرح دریا کا پانی خس وخاشاک کو بہادیتا ہی۔ ویسے ہی میرے دل سے کدورت۔ بغض۔ حسد۔ کینہ۔ رشک تعصب۔ عجب ونخوت اور غرور کے خس وخاشاک کو اپنے دریائے کرم کی موج سے بہادے۔ اے بندوں کے پالنے والے دین ودل

جس طرح اِس کی فیض آبیاری سے تو نے سوکھے جنگل سرسبز اور شاداب کر دیئے ہیں اُسی طرح میری اولاد کو سرسبز و شاداب کر دے اور میری بیل اپنے فیض آبیاری سے سوکھنے نہ دے تتھاستو۔ آمین ثم آمین۔

اے بھاگیرتی تو نے بڑی کرپا کی کہ اتنی دیر تک میں نے تیری سمع خراشی کی اور تو نے دھیان لگا کر میری کہانی سُنی۔ میں تیرا شکر گذار ہوں۔ چوں کہ اب مجھ سے شناسائی ہو گئی ہے اور تیری محبّت نے میرے من میں جگہ پائی ہی اور تیرا پانی پیا ہے اور تیرا پرشاد لیا ہی اِس لئے تیرا احسان مجھے ماننا چاہیئے اب مجھے اگیا دے اگر بھگوان نے چاہا اور زندگی نے وفا کی تو میں کُنبہ کی پرجا کو آکر پھر تیرے درشن کروں گا۔

۲۷۔ جولائی ۱۹۱۳ء
یکم۔ شہر یور (مطابق) ۱۳۲۲ف

آج میں اپنے دو مصاحبین کے ساتھ دیرہ دون کے بعض مقامات دیکھنے اور عام طور پر اُس کی سیر کرنے کی غرض سے گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہوا۔ مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا چاء کے کھیتوں کی طرف نکل گیا جہاں چاء تیاّر ہوتی ہی۔

میں اُس مقام کو دیکھنا چاہتا تھا جہاں چاند سوُرج کے عکس اُتارے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں کے رہنے والوں میں ایسا کوئی شخص میرے ساتھ نہ تھا جو اِس قسم کی چیزیں مجھے دکھلاتا۔

یہاں اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہِ دہلی کا بنوایا ہوا سکھوں کا بڑا بھاری گوردوارہ ہے

جو جہانگیر کے مقبرہ کا گویا جواب ہی۔ اسے عوام الناس جھنڈا صاحب کہتے ہیں۔
اس میں اندر باہر دو تالاب ہیں۔ بیرونی تالاب بہت بڑا ہی جس میں کشتیاں چل سکتی
ہیں۔ اس پر ہر سال بڑا بھاری میلا ہوتا ہی۔ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے یہ علاقہ
گورو رام کو عنایت فرمایا تھا اور گوردوارہ اِن کے رہنے کے لئے بنوایا تھا گورو
رام رائے نے سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں اس شہر کو بسایا۔

ڈیرہ دون سے مسوری جو قریباً ۱۲ میل ہے، راجپور تک جو ڈیرہ دون
سے ۷۔۸ میل ہی۔ ٹمٹم یا تانگہ جاتا ہے۔ اور وہاں سے گھوڑے یا ڈولی میں
جاتے ہیں۔ مسوری شملہ سے دوسرے درجے پر نہایت پُرفضا خوش منظر اور
شاداب پہاڑ ہی۔ یہاں کی آب وہوا نہایت دلپذیر اور نظارہ ایسا دلفریب
ہی کہ دیکھنے سے جی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں سے کوہ ہمالیہ کی برفستانی چوٹیاں بھی
نظر آتی ہیں۔ اور ۳۰ میل کے گھیرے میں رانی کھیت اور چکروتہ کے پہاڑ ہیں۔
مسوری سے ۱ میل نیچے وزیر نیپال کا بنگلہ دیکھنے کے لائق ہی۔

۸۔۹۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۔۳۔ شہریور ۱۳۲۲ف	اِن دونوں میں معمولی کاموں کے سوا کوئی نیا کام نہیں ہوا۔
۱۰۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۴۔ شہریور ۱۳۲۲ف	آج میں چھوٹی حاضری سے فراغت پاکر اپنے مصاحب راجچندر پرشاد کو لے کر گوردوارہ رام رائے کے درشن

کو گیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہی۔ چوں کہ آج شام کو یہاں سے امرتسر کی طرف روانہ

ہونے والا تھا اس لیے دوپہر کے بعد سے سامان کی درستی میں رہا۔ اور چھ بجے شام کے اسٹیشن پر آیا۔ سیلون اور بوگیوں اور ڈبوں کا انتظام پہلے سے کیا جاچکا تھا ۹½ بجے شب کے ڈیرہ دون سے روانہ ہوا۔ سوا گیارہ بجے گاڑی ہردوار کے اسٹیشن پر پہونچی۔ میں نے اپنے ڈبوں کو علیحدہ کرنے کا حکم دیا۔ اور شب کو یہیں رہا صبح کے ۴ بجے رامچندر پرشاد تلجا رام، رام راؤ اور دو خدمتیوں کو ساتھ لے کر گنگا پر آیا۔ اللہ اللہ یہ وقت بھی کیا سہانا وقت ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت سیّد صادق حسین عبّار کے قصیدہ کے کچھ اشعار یاد آگئے۔ ایک وقت اُنھوں نے ایک قصیدہ نعتیہ میرے سامنے پیش کیا جس کی تشبیب میں اس پُرفضا وقت کی نہایت موثر الفاظ میں تصویر کھینچی تھی۔ اس قصیدہ کے کچھ اشعار وقت کی مناسبت کے لحاظ سے حوالہ قلم کرتا ہوں

نقاب الٹتا ہے چہرہ سے خسرو خاور
کہو یہ لیلیِ شب سے کہ اوڑھ لے چادر

ہے وقت پچھلے پہر کا سکونِ خواب کا وقت
خدا کی قدرتِ کامل کا دلکشا منظر

سماں بندھا ہوا جوشِ بہارِ قدرت کا
سکوت چھایا ہوا ہے کائناتِ عالم پر

گھروں کے بند ہیں دروازے سب دکانیں بند
چہل پہل ہے نہ ہنگامہ ہے نہ شور و شر

پرند سوتے ہیں سب اپنے آشیانوں میں
چرند تھان پہ بیٹھے ہوئے جھکائے سر

تمام خلق کو گھیرا ہے خوابِ غفلت نے
گماں ہے شہر خموشاں کا سارے عالم پر

ہر ایک شے پہ سیاہی کا رنگ پھیلا ہے
سیہ ہیں ارض و سما و جبال و بحر و بر

چمک رہے ہیں جو تارے قیاس کہتا ہے
فلک کی نیلی قبا میں ٹکے ہوئے ہیں گہر

چراغِ ماہ کی بھی روشنی ہوئی مدھم
ہے وقتِ برہمیٔ صحبتِ مہ و اختر

بلا کشانِ شبِ ہجر سے کوئی پوچھے
کہ رات تم نے گذاری ہے یارِ بن کیونکر

خیالِ خوابِ پریشاں تھی شب کی بیداری
لگی تھی آنکھ ہوئی انتظار میں جو بسر

وداع ہوتے ہیں دیکھو وہ شاد کامِ وصال
نکل چکی ہے مگر حسرتِ دلِ مضطر

ادھر ہے شوقِ تمنا اُدھر ہے شرم و حجاب
نیاز و ناز کی ہیں صحبتیں یہ پچھلے پہر

اشارے ہوتے ہیں رخصت کے آنکھوں آنکھوں میں
ادھر کی آنکھ اُدھر ہے اُدھر کی آنکھ ادھر

مسافر اُٹھے ہیں پچھلے پہر کی خنکی میں
کمر کو باندھ رہے ہیں لپیٹ کر بستر

وہ شب کی ہلکی سیاہی سحر کی ضو وہ سپید
وہ اک ہے ایک کی رخصت کا دلکشا منظر

شفق کے رنگ میں آمیزشِ سپیدۂ صبح
عروسِ وقت کے تن پر تھا قدرتی زیور

جھکا وہ جانبِ مغرب سرِ مہِ کامل
چلا وہ آنکھیں جھپکتا نجوم کا لشکر

فلک کا چار پہر میں کیا ہے دورہ ختم
ہے شب کے جاگنے کا بار ان کی آنکھوں پر

وہ نکلا صبح کا تارہ وہ رات ختم ہوئی
سفیدۂ صبح کا تھا روئے لیلیٔ شب پر

نمازِ صبح کو اُٹھنے لگے نماز گذار
جھکے ہیں سجدۂ معبود میں تمام شجر

وظیفۂ سحری میں ہیں سب کے سب مصروف
بلند و پست و جبال و بحار و دشت و در

نظر فریب سہانا وہ وقتِ صبح بہار
بھرا ہے کوٹ کے لطفِ خدا کا جس میں اثر

نسیمِ صبح کے وہ خوشگوار جھونکے سرد
جو گدگداتے ہیں غنچوں کو بیدھڑک آکر

ہنسی جو دیر سے غنچے کئے ہوئے تھے ضبط
تو ہنس پڑی لبِ گلیا نگ سے وہ کھل کھل کر

دھلا کے دایۂ ابرِ بہار نے رُخِ گُل
پنھا دیا دُرِ شبنم کا قدرتی زیور

سنک جو پائی ہے موجِ نسیم کی اُس دم
تو سبزہ لیتا ہے انگڑائیاں اُٹھا کر سر

سماں یہ دیکھ کے مُرغانِ نغمہ سنج اُٹھے
سُروں میں گانے لگے بھیرویں بہدیگر

نسیمِ صبح کی دیکھی جو چالِ مستانہ
نظر بھی لوٹ گئی فرشِ سبزۂ تر پر

شجر نہال تھے موجِ صبا کی جنبش سے
گلوں کے رُخ پہ تھا رنگِ بہار کا پوڈر

دُرِ خوش آب کا دانہ تھا موتیے کی کلی
نگینِ عقیقِ یمن کا تھا لالۂ احمر

نسیم آئی دبے پاؤں صحنِ گلشن میں
کہ بوئے گُل کو جو پائے تو لے اُڑے یکسر

پڑے درختوں کی ہلکی سی سنسناہٹ کا
ہوا طیور کی نغمہ سرائیوں پہ اثر

کہ سُر ملا کے گلے بازیاں لگے کرنے
صدا سے تانوں کے تھے وجد میں تمام شجر

ہوا میں گونج رہی ہے جو مُرغِ صبح کی تان
تو ایک وجد ہے طاری تمام عالم پر

دہن سے غنچے کے گرتے ہیں قطرۂ شبنم
کہ جیسے دودھ اُگلتا ہے شیر خوار پسر

مذاقِ شبنم و گُل میں ہی حُسن و عشق کا جذب
اِدھر تو خندہ لبی ہے اُدھر ہے دیدۂ تر

کسے سنائے کوئی داستانِ بلبل و گل
مشاہدہ کا تقاضا ہے دیکھ لو آ کر

وہ دیکھو پہلوئے بلبل میں گُل کی خندہ لبی
سُنو وہ زمزمہ سنجیِ بلبلِ خود سر

نیاز و ناز کی صحبت میں دخل ہی کس کو
ہوائے صبح بھی آئے تو آئے تھم تھم کر

ہوا پرست چمن جا رہے ہیں گلشن کو
نظر فریب ہی اس وقت باغ کا منظر

اِس پُرفضا وقت سے دلچسپی حاصل کرتا ہوا پھر میں گنگا کے کنارے آیا اور ہر کی پوڑی پر اشنان کرکے اپنے پانڈے چندی پرشا دبھگوان داس کو پانچ مُہر انگریزی دے کر سوا سو برہمنوں کو اپنا مہمان کیا۔ اور دریا کے کنارے اپنے ذکر و اشغال میں مصروف ہوا جو لطف اور سرور مجھے اُس مقام پر خاص پانچ بجے صبح کے سہانے وقت حاصل ہوا کبھی گھر میں یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے اسٹیشن کو واپس ہوا۔

۱۱-جولائی ۱۹۱۳ء
(مطابق) ۵-شہریور ۱۳۲۲ ف.

ساڑھے نو بجے یہاں سے گاڑی روانہ ہوکر دو بجے رڑکی پہونچی۔ یہاں پہونچکر خود بخود دل میں خیال پیدا ہوا کہ جب ادھر آئے ہیں تو حضرت علی احمد صابر چشتی پیران کلیر کی زیارت سے بھی مشرف ہولیں یہ خیال آتے ہی اپنے ڈبے علیحدہ کرا کر قیام کا انتظام کیا اور ۳ بجے کرایہ کی بگھی اور تانگہ منگوا کر سیّد صادق حسین غبار اور خدمتیوں کو ساتھ لے کر پیران کلیر کو روانہ ہوا۔

نہر کے کنارے کنارے ہماری سواری جا رہی تھی۔ نصف راستہ طے کیا تھا کہ ایک پل آیا جس پر ایک گاڑی جا سکتی ہی۔ ایسے ضیق اور مشتبہ راستہ سے بگھی میں بیٹھکر عبور کرنا مناسب نہ خیال کیا اِس لئے آخر کنارے تک پیادہ پا گیا۔

اِس پُل کے تیس پینتیس گز نیچے ایک ندی ہی جس کا یہ پُل تھا۔ اِس پل کے ایک طرف اُس ندی پر سے نہر نکالی گئی ہی۔ پُل کے دو طرف جو کٹہرے لگائے گئے ہیں وہ گز سوا گز سے زیادہ اونچے نہیں ہیں اگر گھوڑا شریر ہو تو سوار کی سلامتی مشکل ہی پُل کے اس طرف پہونچکر پھر گاڑی پر سوار ہوا۔ اور درگاہ حضرت صابر چشتیؒ کی زیارت سے مشرف ہوا

گیارہ بجے انگریزی گذران کر درگاہ کے احاطہ میں متولی صاحب سے ملاقات کی جو صحن مسجد میں شطرنجی بچھائے تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ بعض حالات دریافت کئے ۱½ بجے اسٹیشن کو واپس آیا۔ اس بارگاہ میں جلالی شان اپنا اثر دکھاتی ہے۔ شب کو اسٹیشن ہی پر رہا ۷½ بجے روانہ ہونے والی گاڑی میں امرتسر کو روانہ ہوا۔

۱۲۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۶۔ شہریور ۱۳۲۲ف

۷¼ بجے شام کو امرتسر کے اسٹیشن پر گاڑی پہونچی یہاں بابا ہرگیان دیو، بابا ہرسرنداس وغیرہ اور کھتری سوسائٹی کے چند معزز ممبروں نے جن میں لالہ رتن چند و لالہ سیورام و لالہ شیودت وغیرہ بھی تھے نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا اور مجھے پھولوں کے ہار پہنا کر میرے آنے پر اپنی بیحد خوشی کا ثبوت دیا۔ میں نے اپنے ڈیوں کو علیحدہ کرنے کا انتظام کر کے شب کو آرام کیا۔

۱۳۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۷۔ شہریور ۱۳۲۲ف

اوّل وقت بیدار ہوا اور حوائج ضروری سے فراغت پاکر دربار صاحب میں جانے کے لئے تیار ہوا کہ ہرگیان دیو وغیرہ آگئے اور میں اپنے تمام ہندو اسٹاف کے ساتھ دربار صاحب میں گیا۔

میں اس شہر کے تاریخی حالات اور دربار صاحب کی تفصیلی حالت آگے چل کر بیان کروں گا۔ بالفعل میں دربار صاحب میں آیا درشن کئے۔ میرے ساتھ مہنت اور دربار صاحب کے تمام پوجاری اور تماشائی قریب دو تین سو آدمیوں کے تھے یہاں کے درشن سے مستفیض ہو کر بابا اٹل میں اسی مجمع کے ساتھ گیا وہاں کے درشن کر کے دربار صاحب کے سلح خانہ میں گیا۔ ان تمام مقامات کے درشنوں سے

فرصت پاکر گیارہ بجے اسٹیشن کو واپس آیا۔

امرت سر لاہور سے ۳۴ میل کے فاصلہ پر دریائے راوی و بیاس کے مابین واقع ہی سکھوں کے چوتھے گرو رام داس نے اس جگہ جو اکبر بادشاہ نے اسے عطا کی تھی اس شہر کی بنیاد رکھی اور ایک تالاب کھدوایا جسے آبِ حیات کا تالاب سمجھا گیا۔ اسی نام سے یہ شہر اپنا نام اخذ کرتا ہی۔ اس تالاب میں ایک مندر بھی بنوانا شروع کیا جو بعد میں ان کے بیٹے نے ختم کیا۔ ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ افغان نے سکھوں کو بالکل تباہ کرکے شہر کو برباد کر دیا مندر کو بارود سے اڑا دیا تالاب کو مٹی سے بھر دیا جب ۱۸۰۲ء میں رنجیت سنگھ نے امرت سر پر قبضہ کیا اس کے چاروں طرف بڑی چوڑی سنگ مرمر کی روش بنائی اور وسط میں ایک خوبصورت سونے کا مندر جسے انگریزی میں گولڈن ٹمپل (golden temple) کہتے ہیں بنایا۔ یہی مندر دربار صاحب کے نام سے مشہور ہی اس مندر کے اوپر نیچے اندر باہر سنگ مرمر کے اوپر موٹا پتر اسونے کا چڑھا ہوا ہی جس کے سبب اس کی خوشنمائی میں چار چاند لگ گئے ہیں اس کا عکس پانی میں بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہی۔ شب کو یہاں روشنی ہوتی ہی۔ کہا جاتا ہے کہ دیوالی میں یہاں کی رونق دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے دور دور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں مندر کے اندر بڑا گرنتھی اور اس کے چیلے باجے کے راگ کے ساتھ گرنتھ کا پاٹ کرتے ہیں۔ مرد اور عورتیں اندر آکر اپنے نذرانے پیش کرتی ہیں اور گرو گرنتھ صاحب کے سامنے زمین پر سجدہ کرتی ہیں۔ صبح و شام عورتوں کی یہاں زیادہ ریل پیل رہتی ہی جس کے سبب گوردوارہ نمونۂ پرستان بنا رہتا ہے۔ کوئی نہانے کو آتی ہی

کوئی دربار صاحب کے درشن کو کوئی نذرانہ چڑھانے کو کوئی سہیلیوں سے ملنے کو کوئی خرید و فروخت کرنے کو۔ ایسی بہت کم عورتیں شہر میں ہوں گی جو کسی نہ کسی بہانے سے دن میں ایک بار دربار صاحب کا دیدار نہ کرتی ہوں۔ اور حقیقت میں ایک بار دیدار ہونے اور بار بار دیکھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی عقیدت مندوں کے خلوص کا اثر اور اُس مقدس گرنتھ اور برگزیدہ مصنف بابا نانک شاہ جن کے اوصاف بیحد ہیں اور دریائے وحدت کے شناور اور آسمان عرفان کے خورشید مانے جاتے ہیں۔ اِن کے دلی جذبات کے اثرات نے اِس مقام کو بھی پُر اثر بنا دیا ہی۔ اور یہ معلوم ہوتا ہی کہ درحقیقت یہ کسی برگزیدہ بندۂ خدا کا دربار عام ہے۔ اگرچہ عام لوگ صرف بابا نانک شاہ کی خیالی یا فلمی تصاویر تک ہی دید درشن کے مزے لیتے ہیں اور اپنے اظہار عقیدت کو یہ ایک ذریعہ بنا رکھا ہی لیکن حقیقت کے جاننے والے اور ذرّے ذرّے میں آفتاب وحدت کی روشنی دیکھنے والے یہ کہہ کہکر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں ؎

عاشقاں را چہ کار با تحقیق　　　هر کجا نام اوست قربانیم

گوردوارہ کے متصل گھنٹا گھر ہے جس کے چوگرد ایک عالیشان سنگی چبوترہ بنا ہوا ہی جہاں بیٹھکر لوگ دربار اور بازار دونوں کی سیر کیا کرتے ہیں۔

"بابا اٹل" گوردوارے کے پشت کی جانب ایک مقام ہے جو بابا اٹل کے نام سے مشہور ہی۔ بابا اٹل کی سمادھ کے اوپر ایک اونچا منارہ ہے جس پر چڑھکر تمام شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہی۔ اِس سمادھ کے باہر بھی کئی جگہ سونا چڑھا ہوا ہی۔ ایک سونے کا

بڑا اونچا کھمبا ہے۔ سمادہ کے آگے ایک باغ بھی ہے جس میں ہمیشہ سیکڑوں سادھو پڑے رہتے ہیں۔ بابا اٹل میں لاکھوں روپے جمع ہیں جس کے خرچ سے ان سادھوؤں کو کڑھا پرشاد (حلوا) اور لڈو کھانے کو ملتے ہیں یہ سادھو دن بھر بھنگ، چرس اور سلفہ پیتے رہتے ہیں اور نشہ کی ترنگ میں مگن ہو کر کہا کرتے ہیں کہ "بابا اٹل پکی پکائیاں گھل" اکثر عورتیں اور مرد جب اس جگہ آتے ہیں تو بابا اٹل کی سمادہ کے گرد بیٹھکر دروازہ کی چوکھٹوں کو اس طرح دبایا کرتے ہیں جیسے درحصل بابا اٹل کے پاؤں دبا رہی ہیں۔ امرت سر میں یوں تو اکثر تالاب ہیں لیکن ایک تالاب بہت بڑا اور کچا ہی یہ عمیق بھی بہت ہی اس میں مگرمچھ اور پانی کے اور جانور بھی بکثرت ہیں۔ اس میں ایک کشتی بھی پڑی رہتی ہے جس میں بیٹھکر لوگ اس کی سیر کرتے ہیں اس کا نام "سنتھو کہ سر" ہی یہ کسی دھوبی نے بنایا ہی امرتسر کے بعض بازار کسی قدر تنگ ہیں مگر بارونق ہیں ہر قسم کی چیز یہاں ملتی ہی یہ شہر پنجاب میں کپڑے کی تجارت کا مرکز ہے یہاں کے خاص اشیاء ساخت کشمیریوں کے شال ہیں۔

یہاں پر رام باغ، نکلس پارک، اچیسن پارک، قیصری باغ، (اس میں ملکہ وکٹوریہ کا سنگ مرمر کا بت بھی ہی) اور خالصہ کالج قابل دید مقامات ہیں۔ شہر کے باہر ۳ میل کے فاصلے پر قلعہ گوبند گڑھ بھی نہایت عمدہ بنا ہوا ہے۔ آج ہی کی شب دربار صاحب میں میرا تمام زنانہ اسٹاف درشن کو گیا۔

۱۲۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۸۔ شہریور ۱۳۲۲ف	آج بھی میں اسٹیشن ہی پر ڈبوں میں ہوں۔ ابجے صاحبان ذیل میری ملاقات کو آئے اور میں نے ان سے ملاقات کی

بھائی سویا سنگھ، بھائی روڑا سنگھ کنجی بردار دربار صاحب، بھائی شیو دت سنگھ، بھائی مہر سنگھ مہنت، بابا ہرچند داس، مہا سنگھ مع فرزند وغیرہ۔ ان حضرات کے جانے کے بعد دوسرا گروہ کھتری صاحبان کا آیا ان سے بھی ملاقات کی بعد اس کے ٹمپرنس سوسائٹی کا ایک ڈپوٹیشن آیا اور مجھے مدعو کیا کہ میں اِن کے اٹ ہوم میں (جو میرے امرت سر کے آنے کی خوشی میں منعقد کیا تھا اور جس میں شہر کے اکثر عمائد و اکابر مدعو کئے گئے تھے) جاؤں چنانچہ میں لالہ مہر چند عرف فتو سیٹھ جو میرے سمدھی ہوتے ہیں اور اپنے چھوٹے داماد لالہ اقبال چند معروف بہ دولھا راجہ اور غبار صاحب اور دو دو خدمتیوں کے ساتھ شام کے ½ ۵ بجے اِس جلسہ میں گیا۔ معزز ممبران ٹمپرنس سوسائٹی نے نہایت گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا اور تمام معززو عمائد سے جو اس جلسہ میں آئے ہوئے تھے جن کی تعداد ۳۰۰ کے قریب تھی مجھکو ملایا۔ بعد مُعرّفی و شناسائی کے پنڈت لبش نراین راز داں نے کھڑے ہو کر میرے امرت سر میں آنے کے متعلق مسرت خیز لہجہ میں اظہار مسرّت کرتے ہوئے ٹمپرنس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ سوسائٹی "انگلو انڈین ٹمپرنس ایسوسی ایشن لندن" کی ایک شاخ ہی اِس سوسائٹی کو سر لوئیس ڈین و ہز اکسلنسی کمانڈر انچیف و ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب اور صوبۂ ہذا کے رؤسا و والیانِ ملک کی گرانقدر امداد سے مفتخر ہوئے کا فخر حاصل ہی جس کا جواب میں نے مختصر الفاظ میں شکریہ کے ساتھ سوسائٹی کے شریفانہ کام اور اُس کی روز افزوں کامیابی کے

ترقی پر مبارک باد دے کر دو ہزار روپیہ اپنی طرف سے اِس سوسائٹی کو دیا۔ ۷ بجے اسٹیشن کو واپس ہوا۔ پنڈت بشن نراین راز داں ہی کی سعی سے ٹمپرنس سوسائٹی قایم ہوئی ہے اور کھتری کمیونٹی کے معزز ممبر اِس کے معاون ہیں۔ لالہ نند لعل کھتری نہایت جفاکش اور دلچسپی سے اِس سوسائٹی کے کاموں میں حصّہ لیتے ہیں نہایت ہوشیار اور خلیق اور ہر دلعزیز ہیں۔

۱۵۔ جولائی ۱۹۱۳ء
(مطابق)
۹۔ شہریور ۱۳۲۲ف

آج میں نے ایک ہوٹل کا مکان کرایہ پر لیا اور مع زنانہ اُس مکان میں فروکش ہوا۔ اِس کے بازو میں ایک اور مکان تھا اِس میں اسٹاف کے لوگ تھے ۵½ بجے یہاں کے کھتری صاحبوں نے براہ مہربانی میرے خیر مقدم کے اظہار میں ایک جلسہ قرار دیا تھا جس میں تقریباً تین ہزار امرت سر کے عمائد و اکابر کھتری صاحب وغیرہ جمع تھے تعارف اور ملاقات کے بعد راجہ رتن چند صاحب مہری نے جو کھتری سبھا کے سکرٹری تھے کھڑے ہو کر قوم کی طرف سے اڈریس دیا اور میرا خیر مقدم اور میری جدّ بزرگوار مہاراجہ چندولعل بیکنٹھ باشی کا ذکر کرتے ہوئے میری اُن خدمات کا ذکر کیا جو زمانۂ پیشکاری و مدار المہامی میں مَیں نے انجام دیں۔

ختم تقریر پر میں کھڑا ہوا اگرچہ میں تیار نہ تھا۔ بریں ہم اُن کی تقریر کا جواب ادا کرنا مجھے ضروری اور لازمی تھا حسب ذیل ادا کیا۔

"پیارے بھائیو! کل کے اٹ ہوم میں بالکل اچانک مجھے اطلاع ہوئی کہ پنڈت بشن نراین صاحب ٹمپرنس سوسائٹی کے معزز ممبر کی تقریر کے جواب میں

میں بھی شکریہ ادا کروں۔ لیکن اپنے دلی جذبات اور خیالات کو پورے طور سے مجتمع کر کے عرض حال کرنے سے قاصر رہا۔ اتفاق سے آج بھی میرے ہم قوم بھائیوں نے مجھے اپنی ملاقات کا موقع دیا ہے اس لئے میں اس وقت کو مغتنمات سے جان کر اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لئے آمادہ ہوں۔

اے میرے بھائیو۔ اگرچہ میرے جدّ بزرگوار راجہ چند ولعل سکینیٹھ باشی اسی پنجاب کی سرزمین کے تھے اور یہیں سے آصفجاہ کے ساتھ اُن کے بزرگوار دکن گئے مہاراجہ سکینیٹھ باشی نے کئی بار قصد کیا تھا کہ پھر وہ اپنے وطن مالوف کو آکر اپنے بھائیوں کے درشن کریں۔ لیکن مشغولی خدمات نے موقع نہیں دیا۔ یا یہ کہیئے کہ یہ سعادت میری قسمت میں لکھّی تھی جو آج کے روز مجھے حاصل ہوئی جس پر مجھے فخر اور ناز ہے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے بھائیوں نے جس خلوص اور جوشِ محبّت کے ساتھ اس غریبُ الدّیار خادمِ قوم کا خیر مقدم منایا اس کی سپاس گزاری کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ چنانچہ اس محبت کا اظہار پھُولوں کے ہاروں کے انبار سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ کی جانب سے مجھے عنایت ہوئے۔ ایک تو آپ کی مہربانیوں کا بوجھ، دوسری پھولوں کے ہاروں کا۔ یہ دونوں بوجھ میری ایک ضعیف گردن کو برداشت کرنا مشکل تھا مگر جب کہ میں نے اندازہ کیا کہ کون سا بوجھ زیادہ ہے تو فی البدیہ ہاتف نے میرے دل میں یہ شعر موزوں کر دیا ؎

بوجھ پھُولوں کا اُٹھا سکتا ہوں لیکن سچ یہ ہے
میری گردن زیر بارِ منّتِ احباب ہے

اے بھائیو آپ یقین مانیں اور میرا یہ شعر میرا ترجمانِ دل ہی اس میں نہ خوشامد ہی نہ شاعری۔ آپ اس امر کو باور کریں کہ گو دُنیا کی ضرورتوں کے لئے خوشامد یا مُبالغہ کے ساتھ تعریف و ثنا ہمیشہ سے حصُولِ مقاصد کا ذریعہ سمجھا گیا ہی مگر میں نے ان باتوں کو کبھی اپنا شعار نہیں گردانا اور ہمیشہ میری یہی کوشش رہی اور آیندہ رہیگی یہیں جو کچھ آپ صاحبوں کی محبّت اور یگانگت کے اظہار میں اپنی زبان اور قلم سے کام لے رہا ہوں اس میں ہرگز مبالغہ نہیں ہی۔ اگر اس اظہارِ محبّت میں آپ کے خلوص نہ ہوتا تو ہرگز میرا نیاز مند دل اس قدر متاثر نہ ہوتا۔ میرا ہمیشہ سے اس پر عمل ہی ؎

کیا غرض لاکھ خُدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبّت والے

اے میرے معزز ہم قوم۔ آپ نے میرے جدِّ بزرگوار مہاراجہ چندولال بہکنیٹھ باشی کے خاندان کا تذکرہ کرتے ہوئے اِس غریبُ الدّیار فقیر گوشہ نشین کو یاد فرمایا ہی اگر مُبالغہ اور شاعرانہ خیال نہ سمجھا جائے تو میری اس گذارش کو یقین مانیں کہ بیشک مجھے فخر ہی کہ میں اُن کا نام لیوا ہوں اور اُس آفتابِ مجمع الصفات سے کسبِ ضیا کرتا ہوں مگر ؎

طالبِ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

بلکہ اگر مجھے اور میرے خاندان کو فخر ہی تو اِس امر کا ہی کہ میرا خاندان آصفجاہی کہلاتا ہی اور آفتابِ سلطنت کے پیارے چاند محبوبِ دکن اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا یہ خادم

دست گرفتہ اور پروردہ ذرۂ بے مقدار ہے مرحوم ومغفور کی خادمی میں بارہ برس کی عمر سے اڑتالیس ۴۸ برس کی عمر تک حاضر رہا۔ حضرت نے اولاد سے زیادہ میری پرورش فرمائی اور میں نے بھی اپنے کو حضرت خداوندِ نعمت کا ملازم نہیں سمجھا۔ خدا رکھے محبوب دکن کے محبوب ہمارے حال اعلیحضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہٗ العالی بھی اِس آبائی نمکخوار کو اپنے نمکخواروں میں شریک فرماکر پرورش فرمارہے ہیں جو میرے اَن داتا ہیں۔

آپ نے جن خدمات کا اپنی اڈریس میں ذکر کیا ہے وہ آپ کے حسنِ ظن کی ایک دلیل ہے ورنہ سچ پوچھا جائے تو میں نے اپنے فرائض کو ادا کرنے کے سوا کوئی نئی بات نہیں کی۔ اُن خدمات کی نسبت آپ صاحبوں نے اپنے قدر افزا خیالات کا اظہار کیا اور گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی میری خدمات کو منظور فرماکر میری قدر کی اور میرے آقا نے بھی قبول کیا۔ میں اِن سب کو عطائے نعمتِ الٰہی سمجھتا ہوں۔

میرے معزز احباب! اَب میں اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہوئے ایک چیز کا طالب ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور عنایت فرمائیں گے۔ وہ یہ کہ جس طرح آپ کی عنایت اس وقت مبذولِ حال ہے غائبانہ بھی آپ اِس عاجز کو یاد سے فراموش نہ فرمائیں گے

ایسا نہ ہو کہ "سنگِ حضور بہ از برادرِ دُور" کا مصداق صادق آئے۔

اپنی تقریر کو ختم کرنے سے پہلے اِس امر کا اظہار بھی اپنے اوپر لازم وواجب سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے کنگ جارج امپرر آف انڈیا کی سپاس گذاری کرتا ہوں جن کے

مُبارک راج میں کل اقوام نہایت عزّت وآرام اور مذہبی آزادی کے ساتھ بسر کر رہی ہیں اور جن کے مُبارک زمانے کی بیحد برکتیں ہندوستان کو گھیرے ہوئے ہیں اور جس کی بدولت ہر قوم زیورِ علم سے مزّین اور اعلیٰ خدمتوں پر مامور ہی۔ اور آپ کی قوم کا ایک خادم جو اس وقت آپ کے روبرو حاضر ہی ہر قسم کے اعزاز سے معزز و مفتخر ہی اس کے بعد اپنے آقائے ولی نعمت حضور بندگانِ عالی مدظلہ العالی آصفجاہ سابع میر عثمان علی خاں بہادر کی بقائے عمر و اقبال و دولت کے لئے دعا کرتا ہوں جس کے زیر سایۂ عاطفت اُن کا ایک آبائی نمکخوار جاں نثار اعزاز و افتخار کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہی۔ ایک بات اور باقی رہ گئی ہی اور وہ یہ ہے کہ نہایت مسرّت کی بات ہی کہ اہلِ قوم اس طرف متوجہ ہیں کہ اپنی آیندہ اور موجودہ نسلوں کی تعلیم و تربیت زمانہ کے اُصول کے موافق کرنے میں ہمہ تن کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے سُنا ہے کہ لڑکیوں کی بھی تعلیم ہو رہی ہے یہ نہایت ہی ضروری چیز ہی۔ اس لئے کہ اولاد کی تربیت میں زیادہ تر حصّہ ماں سے متعلق ہی۔ علم ہی ایک ایسی چیز ہے کہ گدا کو بادشاہ اور فقیر کو امیر کرے اگر میرا خیال غلط نہ ہو تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تعلیم کے ساتھ ان نونہالانِ چمن قوم کی سوسائٹی بھی اچھی ہو جن سے آیندہ چل کے ہمیں برگ و بار کی اُمید ہی۔ اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ممکن ہو تعصّب اور نفاق، ان دونوں کی بیخ کنی میں زیادہ تر مصروف ہونا ایک ضروری امر ہی۔ یہی دو چیزیں ہیں جن کے سبب سے بڑی بڑی سلطنتوں نے زوال کا مُنہ دیکھا ہی اور اعلیٰ ترین قوموں نے منہ کی کھائی ہی۔ چوں کہ ترقی کا زمانہ ہی ہم کو

لازم ہی کہ وہ طریقہ اختیار کریں جس سے ہم اپنے کو نفع پہونچائیں اور بلا قید ملت و مذہب بندگانِ خدا کی خدمت گذاری کریں جو عین عبادتِ خدا ہے۔ چوں کہ میرا لڑکا عثمان پرشاد جو میری گزشتہ نرینہ اولاد کا یادگار اور مہاراجہ چندو لعل کے قافلے کا خدا رکھے قافلہ سالار ہی جیسا کہ آپ صاحبوں نے آج صبح کو دیکھا ہی کسی قدر بخار سے علیل ہی اس لیے اب اپنے اس سفر کو مختصر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اُمید ہی کہ آپ صاحب مجھے غائبانہ بھی اپنا سچّا اور بڑا خادم سمجھکر جو کچھ خدمت کر سکوں اُس سے ضرور یاد فرمائیں گے میں وعدہ کرتا ہوں کہ دامے درمے سخنے حتی المقدور خدمت گذاری میں کمی نہ کرونگا آپ صاحبوں نے جو میرے لڑکے کو دُعائے صحت دی ہے خدا اس کو قبول کرے اس کے بعد خاص طور پر ٹھاکر کشن سنگھ صاحب سے ملاقات کی یہ دونوں بھائی ریاست کشن گڑھ کے رؤسا میں سے ہیں۔ اخلاق، تہذیب، قومی ہمدردی میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ نہایت خلوص کے ساتھ مجھ سے ملے۔ بعد اِس کے جلسہ برخاست ہوا اور میں اپنی کوٹھی کو واپس ہُوا دوسرے دن بھائیوں نے بازدید کی ملاقات کی۔

۱۶-جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۰-شہریور ۱۳۲۲ف	آج میں اوّل وقت بیجاپور کالج میں مع اپنے اسٹاف کے گیا جہاں میری لئے غیر معمولی طور پر اظہارِ محبت اور یگانگت کی

بزم آرائی کی گئی تھی جب وہاں پہونچا تو کالج کے اسٹاف کے ساتھ اکثر عمائد و اکابر شہر موجود تھے جنھوں نے میرا استقبال کیا۔ میں کالج کے ہر اُس کلاس میں جہاں ناگری اور انگریزی تعلیم دیجاتی ہی گیا۔ بعد اس کے اُس درجہ میں گیا جہاں مُسلمانوں کے

اطفال کو قرآن مجید اور اُس کی تفسیر کی تعلیم دیجاتی ہے۔ وہاں میں نے بعض طلبا سے قرآن مجید کے کچھ سورے پڑھوا کر سُنے۔ معلم صاحب نے بھی سورۂ رحمٰن خوش آوازی سے سُنائی۔ میں اُس ہال میں آیا جہاں اراکینِ کالج و نیز عمائد و اکابر شہر کا مجمع تھا۔

معززین جلسہ نے براہ اتحاد صدارت کی کرسی پر مجھے جگہ دی۔ پہلے ہارمونیم پر طلبا نے خدا کی حمد اور مُبارکباد گائی۔ اِس کے بعد ایک ماسٹر نے اپنی دلکش اور سُریلی آواز میں مے نوشی کی مذمت میں ایک نہایت عمدہ نظم گائی۔ اس کے بعد ہیڈ ماسٹر نے انگریزی میں ایک اسپیچ دی جس میں کالج کے اصولِ تعلیم اور میری خدمات وغیرہ کا ذکرِ خیر تھا۔ ختم اسپیچ پر میں کھڑا ہوا اور کالج کے طریقۂ تعلیم پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ میری تقریر کے ختم ہونے کے بعد پنڈت رام ناتھ صاحب سکرٹری کالج نے بھی مختصر تقریر کی بعد اِس کے میرے دوست لالہ رتن چند صاحب نے کھڑے ہو کر میری طرف سے ایک عطیہ کا اعلان کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔ میں وہاں سے مع تمام حضرات کے اُس مقام پر آیا جہاں اِسی کالج کے طلبا اپنی اپنی قواعد کھلانے کے لیے جمع تھے۔ مجھے اُن کی جمناسٹک کی قواعد سے ایک خاص دلچسپی ہوئی اور میں نہایت محظوظ ہوا۔ اور ۱۰۰ کا انعام اُن طلبہ کو دے کر دس بجے کوٹھی کو واپس ہوا۔

آج میں نے اپنی کوٹھی کے برابر والی کوٹھی میں جو خالی تھی شہر کے تمام عمائد و اکابر کو عام طور پر اٹ ہوم دیا اور اِس کا انتظام اپنے دوست پنڈت گردھاری لعل صاحب بوبنچائی اور بابو نند لعل سکرٹری ٹمپرنس سوسائٹی کے سپرد کیا تھا۔ اِس موقع

کے لئے میں نے فی البدیہہ ذیل گیارہ رُباعیاں ادائے تشکر و امتنان میں کہکر غبار صاحب کو اُن کے چھپوانے کا حکم دیا۔ گو مجھے اُمید نہ تھی کہ آج ہی چھپکر جلسہ سے پہلے آجائیں گی اور تقسیم ہو سکیں گی کیونکہ وقت بہت ہی کم تھا لیکن سید صادق حسین صاحب غبار کی مستعدی نے اُس کو پورا کیا اور جلسہ سے پہلے پانسو قطعہ چھپوا کر میرے سامنے پیش کر دیئے جو میری بیحد خوشی کا سبب ہُوا۔ آگے چل کر اِن رُباعیوں کو ہدیہ ناظرین کروں گا۔ چار بجے سے میرے احباب کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ۵ بجے تک قریب ہزار آٹھ سو معزز مہمانوں نے قدم رنجہ کیا۔ میرے دوست بابو نند لعل سکریٹری ہٹ پرنس سوسائٹی نے اپنی مستعدی و محنت سے رفرشمنٹ کا قابل تعریف انتظام کیا تھا۔ ہر چیز نہایت صفائی و اہتمام کے ساتھ میزوں پر چُنی ہوئی تھی۔ ہر شخص نہایت خوش حال و بشاش نظر آتا تھا۔

$5\frac{1}{2}$ بجے میں اپنی کوٹھی سے نکل کر اپنے اسٹاف اور نیز معزز احباب کے ساتھ اٹ ہوم میں گیا۔ حضار جلسہ سے ملاقات کی۔ ابھی ملاقاتوں سے فراغت ہونے پائی تھی کہ ابر کا ایک ٹکڑا آیا اور ترشح ہونے لگا جس کی وجہ سے کسی قدر بے لطفی ہو گئی۔ مگر رحمت الٰہی کے آثار اور نیک شگون تھا۔ کچھ منٹوں کے بعد برس کر کھُل گیا۔ پھر وہی چہل پہل ہو گئی۔ رُباعیات مطبوعہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے پہلے ہی تقسیم کی جا چکی تھیں۔ بارش کھل جانے کے بعد جب مجمع کی یکجائی ہوئی تو میں نے کھڑے ہو کر حسب ذیل تقریر کی۔

"بھائیو۔ نہایت شکر اور مسرّت کا مقام ہے کہ آپ صاحبوں نے یہاں تک

قدم رنجہ فرما کر مجھے بھی ممنون فرمایا۔

دُنیا کا عام دستور ہے کہ احباب کو مدعو کر کے اُن کی مہمانداری کی خوشی حاصل کرتے ہیں مگر میں ناز کرتا ہوں کہ میرے احباب خود میزبان ہو کر دوستوں اور آشناؤں کی مہمانداری میں مشغول ہیں ؎

وہ آپ آئے مرے گھر کو اور لطف یہ ہے

کہ آئے بھی تو وہ میرے ہی میزباں ہو کر — شادؔ

آپ ہی کہیئے اور آپ ہی بتلایئے کہ اس کو یگانگت نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے اِس کو موافقت نہ کہیئے تو کیا کہیئے۔ یہ "حُبِّ قومی نہیں" تو کیا ہے؟

خدا کا شکر ہے جس قدر میں اپنی قسمت پر ناز کروں تو زیبا ہے قیصرِ ہند عدل گستر خسرو دکن قدما پرور۔ قوم ہمدرد وفی ہنر دھن بھاگ میرے کہ میں بھی ہوں طالع کا سکندر۔

ہمارے پیارے قیصرِ ہند کے یہاں اور احسان ہماری گردنوں پر ہیں از انجملہ یہ بھی ایک احسان ہے کہ ہزاروں کوس کے بچھڑے ہوئے چار روز کی مسافت طے کر کے مل گئے جن کے درشنوں کو نین ترستے تھے اُن کے درشنوں سے من سنتوش ہے۔

اِس دولتِ برطانیہ کا احسان ہے کہ قوم کھتری جو ہمیشہ سے صاحبِ سیف و قلم رہی ہے آج کے روز بھی اپنی میراث کا تمغہ پائے ہوئے عزت سے بسر کر رہی ہے اور

جس کی مبارک حکومت میں کُل اقوام عزت و آرام کے ساتھ شیر و شکر کی طرح مل کر اپنے اپنے خدمات کو انجام دے رہی ہیں۔ اور ہر قوم زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ اور ہر ایک اعلیٰ منصب اور خدمات سے وابستہ ہے۔

یہ اِس عدل پرور گورنمنٹ کی عدل گُستری ہے اور آقا کی قدر دانی کا باعث ہے جیسا کہ کل آپ نے میری خدمات کا ذکر فرماتے ہوئے میرے خطابات کا ذکر فرمایا تھا۔ الحمد للہ کہ معزز و ممتاز ہوں۔ پس ہم سب کو کنگ جارج پنجم قیصرِ ہند کی شکر گذاری کرنی چاہیئے اور ہر وقت دل سے یہ دُعا دینی چاہیئے ؎

عمرت دراز باد کہ تا دورِ مشتری

ما از تو برخوریم تو از عمر برخوری

اے بھائیو۔ اگرچہ میں ابھی ایک دو شب تاوقتیکہ برخوردار عثمان پرشاد کا ٹمپریچر اعتدال پر آجائے، یہاں حاضر ہوں لیکن ابھی سے جدائی کا کھٹکا دل کو چھیڑتا چلا جا رہا ہے اور وقت زبانِ حال سے یہ کہہ کہکر چونکا تا رہتا ہے ؎

غنیمت جان لو مِل بیٹھنے کو

جُدائی کی گھڑی سر پہ کھڑی ہے

مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا روحی وصال اور یکایت بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ ضرور ہے۔ پس جو تعلقات روحانی ہیں اُن میں جُدائی نہیں ہوسکتی۔ اِس کو اُس وقت تک بقا ہے جب تک پرماتما شکتمان کی ہستی اور اُس کے اسما ر صفات کو بقا ہے۔

اَبْ میں دُعا کرتا ہوں ۔ اے ہندو اور مُسلمان بھائیو ۔ خدائے تعالیٰ آپ کی عمر اور نسلوں میں برکت دے اور آپ میں انسانی ہمدردی ، یکجہتی اخلاق روز بروز زیادہ ہو ۔ اور آپ اپنی منصف گورنمنٹ اور حکمراں کی خیر خواہی کے امتحان میں ہمیشہ پُورے اُتریں اور اپنی اولاد کی تعلیم اور تربیت کی طرف مدام متوجہ ہوں اور اپنے نیازمند دوستوں کو فراموش نہ کریں اور آپ کی نسلیں پھلیں پھولیں اور پروان چڑھیں ۔ اور آپ کا نیازمند دعاگو شادؔ اپنے احباب کی خوشیوں میں ہمیشہ شریک رہی اور خدمت گزاری کو آپ صاحبوں کی دامے درمے سخنے اپنے لئے باعث فخر سمجھے ۔ آخر میں میں راؤ بہادر پنڈت گردھاری لعل اور پنڈت سروپ نراین رازداں اور رایو نند لعل صاحب کا شکر گذار ہوں جنھوں نے محفل آرائی میں دلچسپی و مہربانی سے حصّہ لیا ۔ اور نیز لالہ شیودت داس ۔ لالہ رتن چند اور نیز لالہ دیوان چند اور پنڈت بشن نراین رازداںؔ کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے اپنی سچّی یگانگت اور اور برادرانہ روابط اور مسافر نوازی میں اپنی عالی حوصلگی کو کام فرمایا ۔

بعد اِس کے پنڈت بشن نراین رازداںؔ اور نیز رتن چند وغیرہ معزز احباب کی فرمایش پر سیّد صادق حسین عبّاؔر نے بلندی پر کھڑے ہو کر دہ رُباعیاں پڑھیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہی ۔

رُباعی

نکلا ہُوا گل اِسی چمن میں آیا	بھُولا ہوا لفظ پھر سخن میں آیا

اے قوم یہ شاد ہی تمہارا بھائی
دو صدیوں کے بعد پھر وطن میں آیا

ایضاً

اللہ رکھے جارج پنجم کو شاد
آصف بھی رہیں ہمیشہ شاد و آباد
دیتا ہوں دعا یہ قوم کی جانب سے
زندہ رہیں دونوں مع آل و اولاد

ایضاً

کس منھ سے کہوں کہ میزباں ہوں ان کا
حالاں کہ حقیقتاً میہماں ہوں ان کا
احباب وطن ہیں میرے میری محسن
ہیں دل سے زباں سے قدرداں میں انکا

ایضاً

احباب کے آنے سے میں مسرور ہوا
ممنون ہوا بہت ہی مشکور ہوا
شکر ان کا ادا ہوا نہو گا اے شاد
ناظر تھا جن کا اُن کا منظور ہوا

ایضاً

دیکھا اخلاق مہربانی دیکھی
مہماں نے تمہاری میزبانی دیکھی
بھولے گا کبھی نہ شاد خاطر داری
اے قوم تمہاری قدردانی دیکھی

ایضاً

بھولوں گا کبھی نہ مہربانی ان کی
جائیگی نہ دل سے قدردانی ان کی
احباب ہیں شاد مجھ سے میں ان سے شاد
یارب رہے شاد زندگانی ان کی

فکر و الم و رنج سے آزاد رکھے	رباعی	آباد رکھے ہمیشہ دل شاد رکھے
دن رات یہی دعا ہی میری ای شاد		کل قوم کو ذوالجلال آباد رکھے

ایضاً

نہ وقفِ صلوٰۃ و صائم صوم ہوں میں		نے عیش پسند و خوگر نوم ہوں میں
میں کچھ بھی نہیں اگرچہ سب کچھ ہوں شاد		ہاں فخر یہ ہے کہ خادمِ قوم ہوں میں

ایضاً

دردا یہ فلک کی کیسی بیدردی ہی		ہمدرد کوئی نہ کوئی یاں وردی ہی
درد اپنا کسے ہی اس زمانہ میں شاد		ہمدردیِ قوم اپنی ہمدردی ہی

ایضاً

پایا نہ شہر میں نہ دشت و در میں		آرام ملا جو ہم کو امرت سر میں
اے قوم تمہاری مہربانی یہ ہی		بیٹھا ہی شاد گویا اپنے گھر میں

ایضاً

مشفق کوئی کوئی مہرباں ہے میرا		محسن کوئی کوئی قدرداں ہی میرا
کل تک تھا شاد اُن کا مہماں پر آج		یہ مجمعِ قوم میہماں ہے میرا

۹ بجے جلسہ برخاست ہوا۔ اور میں اپنے بعض احباب کے ساتھ جن میں پنڈت بشن نراین۔ نگینہ مل۔ لالہ رتن چند۔ سردار بشن سنگھ۔ رام ناتھ سیٹھ۔ پنڈت بنواری دت وغیرہ تھے اپنی کوٹھی کو واپس ہوا۔ ڈاکٹر کرنل اسمتھ جو نہایت ہی لایق اور اپنے فن کے

سرسید کے دو رفیق

(منقول از رسالہ "مخزن" جلد ۴ نمبر ۵ بابت فروری ۱۹۰۳ء)

یہ خان بہادر برکت علی خاں اور سید زین العابدین کا مرثیہ ہے جو سرسید کے بڑے حامی اور رفیق تھے اور جنہوں نے آگے پیچھے ۱۹۰۲ء میں وفات پائی

حیف دنیا سے کیا برکت علیخاں نے سفر
جس سفر سے ہے جوانوں کو نہ بوڑھوں کو مفر

جس کی جانب سے ہے چوکنا گدا ہو یا کہ شاہ
گھات میں ہے جو ہر اک جاندار کی شام و سحر

پر مبارک ہے سفر اُن کا کہ جو پیش از رحیل
کر گئے لاکھوں کو ممنون نیکیوں سے اپنے گھر

فیض پہنچاتے رہے یوں اپنے بیگانے کو وہ
رہگذر پر میوہ افشاں جیسے نخلِ باردور

ہیں وہی انسان جو آتے ہیں ہم جنسوں کے کام
ورنہ ہیں انساں سے سو بار بہتر جانور

ہیں یہی وہ لوگ۔ جو جیتے ہیں اوروں کے لیے
کھاتے ہیں خود زخم۔ پر اوروں کو دیتے ہیں ثمر

ہیں جماعت کے یہی دنیا میں وہ فرد فرید
جو کہ مر کر توڑ جاتے ہیں جماعت کی کمر

ہیں اُمیدیں قوم کی البتہ اُن کی ذات سے
اُن کا ماتم "قوم کا ماتم" ہے قصہ مختصر

کوششیں برکت علیخاں کی رہینگی یادگار
جو فلاحِ قوم میں اُس سے ہوئی ہیں جلوہ گر

پھر نہ کھولی ایک دم جبتک کہ دم میں دم رہا
قوم کی خدمت پہ جب سے اُس نے باندھی تھی کمر

گو کہ ضعف و ناتوانی نے بہت پھیلائے پاؤں
کر سکے چھوڑی اُس نے لیکن جو مہم کرنی تھی سر

اُس کو مشتِ استخواں لیکر پہنچنا تھا ضرور
جب کسی تقریب قومی کی اُسے پہنچے خبر

قوم کی خدمت کا جو سید سے سیکھا تھا سبق
وہ سبق مرحوم نے بھولا نہ ہرگز عمر بھر

اسکی دل سوزی جہاں چھپ چاپ کے جاتی تھی کام
واں فصیحوں کی فصاحت تھی سراسر بے اثر

روحِ قومیت کی اُس نے پھونک دی پنجاب میں
ہو گئے اپنے پرائے مل کے سب شیر و شکر

جو اثر رکھتا ہے گھر والوں پہ اک گھر کا بزرگ
قوم پر پنجاب میں اُس کا وہی دیکھا اثر

ڈبوں کو علیحدہ کرا کر ایک طرف قیام کیا۔

۱۸- جولائی ۱۳ ۱۹ء سنہ (مطابق) ۱۲- شہر یور ۲۲ ۱۳ سنہ ف میں اپنے سائڈنگ پر خاص گاڑیوں میں مقیم رہا۔ چھوٹی حاضری سے فارغ ہو کر مشہور مزارات اور مقدس مقامات کی زیارات سے مشرف ہوا۔

لاہور راولپنڈی سے (۱۷۴) میل کے فاصلہ پر شہر لاہور یعنی دارالسلطنت پنجاب دریائے راوی کے کنارے آباد ہے۔ یہ بہت پرانا شہر ہے۔ ہندوؤں کے خیال کے مطابق اس کی نبیاد راجہ رام چندر جی کے بیٹے لو نے ڈالی تھی۔ چنانچہ اب تک اس کا نام ہندی و سنسکرت کے شاستروں و گرنتھوں میں "لو پوری" لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ یہاں کے قدیم بازار تنگ اور ٹیڑھی گلیاں ناصاف، مکانات بہت اونچے ہیں یہاں صرف بڑے بڑے مکانوں میں صحن رکھا جاتا ہے۔ تمام مکانوں میں صحن رکھنے کا رواج نہیں ہے۔

شہر کے گرد پختہ فصیل بنی ہوئی ہے جس میں تیرہ دروازے ہیں۔ دیوار کے چاروں طرف باغ لگا ہوا ہے اور ایک نہر جو قریباً تین گز چوڑی ہے بہتی ہے۔

یوں تو یہاں ہر ایک دروازہ کے ساتھ ایک ایک لمبا اور بارونق بازار ہے مگر ان کے علاوہ شہر سے باہر انارکلی، اندر ڈبی بازار، ہتی کا چوک۔ کشمیری بازار لوہاری منڈی، بازار حکیمان وغیرہ میں ایک خاص رونق ہے۔ انارکلی سے میلوں تک لمبی لمبی سڑکیں اور دو طرفہ کوٹھیاں بنتی چلی گئی ہیں۔ جو نفیس المزاج ہیں

وہ انارکلی کے مکانوں یا کوٹھیوں میں آباد ہیں۔

یہاں سیر کے لئے بہت سے باغ تالاب اور سڑکیں ہیں خصوصاً مال روڈ جس پر ملکۂ معظمہ وکٹوریا کا سیاہ بت ہے اور رات کو بجلی کی روشنی ہوتی ہے، نہایت خوب صورت اور بارونق ہے اور قریب ۳ میل کے طولانی ہے۔

یہاں کے باغوں میں شالامار باغ قابل دید ہے۔ یہ باغ شاہجہاں بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے۔ اس کے ۳ طبقے ہیں جس میں قسم قسم کے پھل اور پھول لگے ہوئے ہیں ہر طبقے سے دوسرا دوسرے سے تیسرا نشیب میں بنا ہوا ہے اور ہر ایک میں ایک پختہ نہر گزرتی ہے جس کے آس پاس نہروں کی روش بنی ہوئی ہے اور بیچ میں جا بجا فوّارے لگے ہوئے ہیں جو موسم برسات میں بہار دیتے ہیں۔ ہر طبقے میں سنگ مرمر کی بارہ دری بیٹھنے کے لئے بنی ہوئی ہے۔ ایک سفید پتھر کا تخت بھی پڑا ہوا ہے جس کے پیچھے کی جانب سنگ مرمر کی ایک چادر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اس میں برسات کے موسم میں پانی کا جھرنا نہایت لطف خیز ہوتا ہے۔ باغ کے گرد اونچی اور پکّی دیوار ہے یہ باغ پنجور کے باغ کے نمونہ پر بنا ہوا ہے جو کالکا کے قریب ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے مگر سنگ مرمر کا کام اس میں اس سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ قلعہ ثمن برج، بادشاہی مسجد، وزیر خاں کی مسجد، سنہری مسجد وغیرہ اور قلعہ کے اندر کئی محل حضوری باغ میں سنگ مرمر کی بارہ دری۔ مہاراجہ رنجیت کی سمادھ سکھوں کی بنائی ہوئی چڑیا خانہ عجائب گھر، یونیورسٹی کالج، میڈیکل کالج، اورینٹل کالج، لا کالج، گورنمنٹ کالج

یونیورسٹی ہال، ڈاک خانہ، ہسپتال، ریلوے اسٹیشن، چیف کورٹ وغیرہ عمارات قابل دید ہیں۔ لاہور سے ۴ میل کے فاصلے پر لاہور چھاؤنی یعنی میاں میر آبادی

۱۹۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۳۔ بھادوں ۱۳۲۲ ف

آج میں کہیں نہیں گیا۔ ایک بجے کی گاڑی میں میرے سمدھی لالہ مہر چند عرف فتو سیٹھ اور میری لڑکی اور داماد لالہ اقبال چند عرف دولھا راجہ کشمیر کو روانہ ہوئے ½ ۳ بجے مولوی محمد عبدالعزیز صاحب منیجر پیسہ اخبار اور سید جالب صاحب دہلوی جائنٹ اڈیٹر پیسہ اخبار ملاقات کے لئے آئے (اس ملاقات کی کیفیت پیسہ اخبار مطبوعہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء میں مفصلاً درج ہے) ۵ بجے شام کے میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا آئے بہت دیر تک لطفِ صحبت رہا۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں خدا زندہ رکھے۔ چونکہ برخوردار عثمان پرشاد طال اللہ عمرہ کا مزاج اچھا نہیں ہے اس لئے حسب مشورہ ڈاکٹر محمد اقبال ڈاکٹر محمد حسین کو جو لاہور کے نامی ڈاکٹر ہیں طلب کرکے دکھایا۔ یہ صاحب نہایت ہی خلیق اور اپنے فن کے تجربہ کار ہیں۔ سیٹھ فتو صاحب اور لالہ بشن نراین رازداں نے ڈاکٹر پنڈت رائے بالکشن جو برہمن کی قوم سے اور نہایت لائق اور ستودہ صفات ہیں بلاکر بچے کو دکھایا۔

۷ بجے شب کو بابو نندلعل سکرٹری ٹمپرنس سوسائٹی امرت سر سے آئے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک میں اُن سے باتیں کرتا رہا۔ ۹ بجے پھر ڈاکٹر محمد اقبال آئے اور اُن کے اصرار سے مع دو مصاحبوں کے آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر میں گیا۔

۱۲½ بجے میں وہاں سے واپس آگیا۔ آغا حشر بہت خوبیوں کے اور آشنا پرست شخص ہیں

۲۰-جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۴ شہریور ۱۳۲۲ف آج میں لاہور سے شب کی ٹرین میں واپس ہونے والا تھا کہ ۴ بجے شام کے رائے بہادر رام سرن داس و پنڈت رائے بالکشن آئے۔ میں اُن سے ملا انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُن کا مہمان بنوں ہرچند میں نے اصرار کیا کہ میں اپنے فرزند برخوردار عثمان پرشاد اطال اللہ عمرہٗ کی علالت سے کسی قدر پریشان ہوں اور یہاں گرمی بھی زیادہ ہی جس سے اس کے ٹمپریچر کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہی مگر رائے بہادر موصوف معمولی اخلاق کے بشر نہیں ہیں اس طرح مجبور کیا کہ بمصداق ؎

خیال خاطرِ احباب چاہیئے ہردم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میں اُن کی دل شکنی گوارا نہ کر سکا اور وعدہ کیا کہ کل آؤں گا۔

۲۱-جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۵-شہریور ۱۳۲۲ف ابھی چھوٹی حاضری سے فارغ ہوا تھا کہ میرے معزز میزبان رائے بہادر رام سرن داس مع پنڈت دینیال شرما صاحب دہلوی لکچرار سناتن دھرم آئے اور مجھے میرے تمام زنانہ و مردانہ اسٹاف کے ساتھ اپنی کوٹھی میں لے گئے۔ ڈبوں میں تمام سامان اور کچھ ملازمین رہے۔ شہر کے عمائد و اکابر و اہل برادری میری ملاقات کے لئے آئے اور میں اُن سے مل کر نہایت محظوظ ہوا۔

۲۲ - جولائی سنہ ۱۹۱۳ء
(مطابق)
۱۶ - شہریور سنہ ۱۳۲۲ف

پنڈت دین دیال شرما، پنڈت گوبند رام سکرٹری دھرم سبھا لالہ بیلی رام کھتری رئیس، لالہ کرم چند مجسٹریٹ، لالہ دیوان کشن مجسٹریٹ سے ملاقات کی۔

بعض اکابر و معززین برادری نے میرے لاہور میں جو میرا جدّی وطن ہے آنے کی خوشی میں ایک جلسہ تھیٹر ہال میں منعقد کیا اور میں ۶ بجے شام کے رائے بہادر رام سرن داس و لالہ کرم چند مجسٹریٹ و ڈاکٹر محمد اقبال اور نیز دیگر معزز حضرات کی معیت میں اس جلسہ میں گیا۔ تقریباً دو ہزار ہندو مسلمان اس جلسہ میں شریک تھے ڈاکٹر سر پرتول چند رچٹرجی جو وہاں کے سربر آوردہ عہدہ داروں میں سے ہیں اور جن کے اخلاق ستودہ نے تمام شہر میں اُن کو ہر دل عزیز کر رکھا ہے، بہ حیثیت صدر اپنی افتتاحی تقریر میں باشندگان لاہور کی طرف سے گرم جوشی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ اِن کے بعد پنڈت دینہ دیال شرما نے ایک تقریر کی جس میں میرے خاندانی اعزاز اور میری خدمات اور میرے اُن داتا حضور نظام کے ساتھ میری خیر خواہانہ ارادت کا ذکر تھا۔ اس کے جواب میں میں نے جو تقریر کی وہ درجِ ذیل ہے۔

"حضرات! جس اظہار اتحاد اور مہربانی سے آپ بھائیوں نے خادم قوم کو اس محفل میں شریک ہونے کا موقع دیا اس کے متعلق میں اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

'شکر نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو'

جن جن مقدس اور متبرک مقامات کا درشن کرتے ہوئے میں یہاں حاضر ہوا، اس سے صرف مقصود یہ تھا کہ اپنے جدّی وطن کو ایک بار دیکھوں اور وطنی بھائیوں سے ملاقات کی مسرت حاصل کرکے جلد واپس ہو جاؤں اس لئے کہ میرا لڑکا جو یادگار ہے میرے گزرے ہوئے قافلہ کا وہ علیل ہے اور ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ کسی معتدل کلیمٹ کے مقام پر لیجاؤں۔ اگرچہ تخمیناً دو سو برس کے عرصہ سے میرے خاندان سے یہاں کوئی نہیں آیا اور میرے جد اعلیٰ کی بارہا خواہش ہوئی مگر کاروبار ریاست کے باعث عدیم الفرصتی مانع رہی اور وہ موقع مجھے نصیب ہوا گویا یہ سمجھنا چاہیئے کہ تخمیناً دو سو برس کے بعد اس سرزمین پر میرے خاندان میں سے میں ہی ایک پہلا شخص ہوں کہ حاضر ہونے کی مسرت حاصل کی ہے۔ اگرچہ میرے خاندان کا تعلق راجہ ٹوڈرمل سے ہے مگر درحقیقت زیادہ افتخار اس خاندان کو اس لئے حاصل ہے کہ میرا خاندان بندۂ آصف جاہی کی عزت رکھتا ہے جن جن اعزاز سے میرے بزرگ ممتاز رہے ان سے بدرجہا زیادہ میرے آقائے ولی نعمت حضرت محبوب دکن مرحوم و مغفور نے اس ناچیز کو سرفراز فرمایا اور آصف جاہ سابع حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ نے بھی انھیں اعزاز و مراتب سے مفتخر اور ممتاز فرما رکھا ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق کی بات ہے کہ ایسے زمانہ میں میں یہاں آیا ہوں۔ جب کہ میرے کرم فرما سر مکیل اڈویر لفٹننٹ گورنری کی کرسی پر کرسی نشین ہیں۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ۔ اگرچہ میرا جلد واپسی کا خیال تھا لیکن میرے مشفق مہربان رائے بہادر

رام سرن داس جن کو خلق مجسم کہنا بیجا نہ ہوگا اور ہمارے پنڈت دین دیال شرما سحر البیان کی اخلاقی اور جادو بھری باتوں نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ دو شب کے لئے میں آپ صاحبوں کی خدمت گزاری میں حاضر ہوں۔ اس سفر میں پنجاب کی علم دوستی اور تحصیل علم کے شوق و ذوق اور اس کے عروج کو دیکھکر نہایت ہی خوش ہوا۔ اور یہ بھی زیادہ تر مسرت کے لائق بات ہے کہ اس کے ساتھ ہی اس امر کی اصلاح کی طرف بھی سعی مبذول ہے کہ تعصب مذہبی اور آپس کے نفاق کو دور کریں۔

درحقیقت یہ ایک نہایت مبارک اور مستحسن سعی ہے۔ خدائے تعالیٰ آپ صاحبوں کی اس سچی خلوص بھری سعی کو مشکور اور قبول کرے۔

مجھ فقیر حقیر کے خدمات کی جو کچھ آپ صاحبوں نے قدر افزائی فرمائی اس کو میں آپ صاحبوں کا حسنِ ظن یقین کرتا ہوں ورنہ میں نے بجز اس کے کہ اپنے فرائض کو ادا کیا اور کوئی نئی بات نہیں کی۔ انشاءاللہ جب تک زندہ ہوں میں ملک اور مالک کی خدمت گزاری کے لئے ہر وقت مستعد ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کو خدمت گزاری کے لئے وقف کر دیا ہے۔

برٹش راج کا ہم سب کو احسان ماننا چاہیئے کہ اسی راج کے مبارک خیالات کے پرتو کا طفیل ہے کہ ہندوستان کے ہر ملک اور ہر قوم میں تحصیل علم، یک جہتی، بے تعصبی اور انسانی ہمدردی جو ہماری بھولی ہوئی چیزیں تھیں وہ تازہ ہو رہی ہیں اور ہم لوگ اب اپنے آپ کو پہچاننے کی قابلیت پیدا کر رہے ہیں اور اس امر کو بھی محسوس کرتے

جانتے ہیں کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے خدا سے اُمید ہی کہ اس برٹش حکومت کے سایہ ہما پایہ میں ہم اور ہماری نسلیں ہر طرح کی کامیابیاں حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے ممنون منت ہونگی - میری یہ دعا ہی کہ ہندوستان اور اس کی رعایا ہمیشہ فضل الٰہی کی بدولت برٹش راج کے زیر سایہ پھلے پھولے اور آباد رہے مجھے اُمید ہی کہ اے بھائیو! آپ لوگ اس نیاز مند فقیر شادؔ مسافر کو اپنی یاد سے فراموش نہ فرمائیں گے - اگر میں آپ حضرات کی بلا قیدِ قوم و ملّت کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو اس کو میں اپنے لئے باعثِ فخر سمجھونگا۔

آخر میں اعلان کیا گیا کہ کل ½ ۵ بجے شام کے ایک گارڈن پارٹی ٹاونہال کی گراونڈ (زمین) پر آنریبل رائے بہادر لالہ رام سرنداس صاحب کی طرف سے باعزاز سر مہاراجہ بہادر دی جائے گی - قریب ½ ۸ بجے کے میں کوٹھی کو واپس ہوا -

۲۳ - جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۷ - شہریور ۱۳۲۲ ف

آج صبح کو میں ½ ۷ بجے مع اپنے ہندو اسٹاف کے گورو ارجن گورودوارہ میں گیا جو قلعہ کے متصل ہی وہاں کے گرلز اسکول میں گیا - وہاں سے بعض اور دواروں کے درشن کرتا ہوا (۱۱) بجے کوٹھی کو واپس ہوا - چونکہ آج انجمن حمایت اسلام لاہور کا ایک ڈیپوٹیشن آنے والا تھا ½ ۳ بجے وہ ڈیپوٹیشن آیا - سید صادق حسین صاحب غبارؔ اور راجیندر پرشاد نے اُن کا استقبال کیا میں نے اُن سے ملاقات کی -

انجمن حمایت اسلام کے اغراض و مقاصد

یہ انجمن ۱۸۸۴ء سے "انجمن حمایت اسلام لاہور" کے نام سے قائم ہوئی ہی -

جس کے چھ اغراض و مقاصد یہ ہیں۔

(۱) معترضین اصول مذہب مقدس اسلام کے اعتراضوں کے جواب تحریری یا تقریری تہذیب کے ساتھ دینا اور اس مقدس مذہب کے اصول کی حمایت اور اشاعت کرنا۔

(۲) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی دینی و دنیوی تعلیم کا انتظام کرنا تاکہ وہ غیر مذہب والوں کی تعلیم کے اثر سے محفوظ رہیں۔

(۳) مال وزکوٰۃ یا ایسے مال سے جو اصحاب معاونین اس غرض کے واسطے عطا فرمائیں، لاوارث، مفلس، یتیم مسلمان بچوں کی پرورش اور تربیت کا انتظام کرنا اور مفلس مسلمان بچّوں کی تعلیم میں حتی الوسع امداد دینا جو بہ سبب عدم توجہی مسلمانوں کے عموماً خراب اور آوارہ ہو جاتے ہیں اور بے بسی کی حالت میں نعمت اسلام سے بے نصیب ہو جاتے ہیں۔

(۴) اہل اسلام کو اصلاح طرز معاشرت و تہذیب اخلاق اور تحصیل علوم دینی و دنیوی اور باہمی اتفاق و اتحاد کا شوق دلانا اور ان کی ترقی و بہتری کے وسائل پیدا کرنا اور تقویت دینا۔

(۵) اہل اسلام کو گورنمنٹ کی وفاداری اور نمک حلالی کے فوائد سے آگاہ کرنا۔

(۶) ان اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے واسطے واعظوں کے تقرر، ماہواری رسالے کے اجرا، مدارس، کالج اور یتیم خانے کے قیام اور دیگر مناسب وسائل کو عمل میں لانا۔

اِن اغراض کی تکمیل کے واسطے انجمن کی طرف سے کئی واعظ ہیں جو سرِ دجات ہیں انجمن کے مقاصد کی اشاعت اور برادرانِ اسلام سے انجمن کے لئے امداد طلب کرتے ہیں۔ اِن کے پاس قلمی سند ثبتہ دستخط میرِ مجلس و سکرٹری انجمن موجود ہی۔

(۷) زنانے مدرسے ہیں جن میں کلام اللہ اور دینی و دنیوی کتابوں کی تعلیم کے ساتھ ضروری دستکاری سکھائی جاتی ہی۔

ماہ محرم ۱۳۰۲ھ سے لڑکوں کی دینی و دنیوی تعلیم کے لئے ایک اسکول لاہور میں جاری ہوا۔ جو یکم جنوری ۱۸۸۸ء سے مڈل کے درجے تک یکم جنوری ۱۸۹۱ء سے انٹرنس کے درجے تک پھونچا۔ یکم مئی ۱۸۹۲ء سے ایف اے تک کالج بنا۔ یکم جون ۱۹۰۰ء سے بی اے اور یکم جون ۱۹۰۶ء سے ایم اے بھی کھل گیا ہی۔ اس اسکول و کالج میں ایک ہزار چھ سو سے زیادہ طلبا دینی و دنیوی تعلیم پاتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں شریک ہوکر علی العموم عمدہ نمبروں پر پاس ہوتے ہیں۔ شروع ۱۸۹۱ء سے اسکول و کالج کے متعلق ایک بورڈنگ ہوس بھی ہی جس میں بورڈاوں کی ہر طرح نگرانی نہایت خوش اسلوبی سے ہوتی ہی۔

ہفتہ وار جلسۂ وعظ اسلامیہ اسکول میں ہوتا ہی جس میں مدرسین، پروفیسر واعظ اور طلبا اپنی تحریروں اور تقریروں سے اپنے بھائیوں کو مستفید کرتے ہیں۔ انجمن کے سابق میرِ مجلس خلیفہ حمید الدین صاحب مرحوم کی یادگار میں ایک عربی دینی مدرسہ موسوم بہ "مدرسۂ حمیدیہ" اکتوبر ۱۸۹۷ء سے کھولا گیا ہی جس میں اعلیٰ دینی تعلیم

دی جاتی ہے۔ ایک ماہوار رسالہ چھپتا ہے جس میں انجمن کی کارروائی تہذیب کے ساتھ مخالفین مذہب اسلام کے جواب اور اُن کے مذہب کی تردید اور مسلمانوں کی حالت کی درستی کے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ بچّوں کی تعلیم کے واسطے بہت سی کتب چھپ گئی ہیں۔ جن میں سے اکثر اسلامیہ اسکول و کالج کی تعلیم میں داخل ہونے کے سوا سارے ہندوستان کے اسلامی اور بعض سرکاری صوبجات میں اور ریاستوں کے مدارس میں درج ہیں اور کتابیں بھی تیار ہو رہی ہیں جو مرتب ہونے کے بعد آہستہ آہستہ انشاء اللہ چھپتی جائیں گی۔ مسلمانوں کے لاوارث یتیم اور مسکین بچّوں کی پرورش کے واسطے جو بیکسی کی حالت میں پادریوں کے ہاتھ آجاتے تھے یتیم خانہ کھل گیا ہے اس میں سوا سو سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں داخل ہیں جن کی خوراک و پوشاک کا نہایت معقول انتظام ہے۔ علاوہ ازیں بعض مفلس اور یتیم بچّوں کو اسکول و کالج اور مدرسۂ حمیدیہ میں وظیفہ دیا جاتا ہے۔ بعض کو فیس۔ چنانچہ ان سب مندرجۂ بالا کاموں پر پانچ ہزار روپیہ ماہوار سے زیادہ خرچ ہوتا ہے جو ہمدردانِ قوم کے چندوں سے پورا ہوتا ہے۔

سکرٹری انجمنِ مذکور نے کھڑے ہو کر اغراض و مقاصد انجمن حمایت اسلام بیان کئے اور جمع و خرچ کی اجمالاً تفصیل کی۔ میں نے اس کا مختصر الفاظ میں جواب اور یتیم خانہ کے لئے ایک ہزار روپیہ دیا۔ اس ڈپوٹیشن کے جانے کے بعد میں بمعیت رائے بہادر رام سرن داس گارڈن پارٹی میں گیا جہاں بہت سے حضرات موجود تھے سب احباب سے مل کر مسرت حاصل کی۔

ایک شخص نے کچھ کرشمے اور بازی گری دکھلائی جس سے حاضرین جلسہ محظوظ ہوئے۔ شام کے ½، بجے کوٹھی کو واپس ہوا۔

۲۴۔ جولائی ۱۳ ۱۹ء (مطابق) ۱۸۔ شہریور ۱۳۲۲ ف

آج شام کو ایک دوسرا عظیم الشان جلسہ آنریبل رائے بہادر رام سرنداس کی طرف سے ہرکیشن تھیٹر ہال میں منعقد ہونے والا ہے اور ۳ بجے سہ پہر کو ایک ڈپوٹیشن بھی کھتری کانفرنس سنٹرل کمیٹی لاہور کا آنے والا ہے۔ میں یہاں سے غبار صاحب کو ساتھ لے کر ۱۱ بجے بسواری موٹر شاہدرہ گیا جہاں جہانگیر شہنشاہ دہلی کا مزار ہے۔ اور اس کے تھوڑے ہی فاصلہ پر نور جہاں بیگم اور اس کے بھائی آصف جاہ کا مقبرہ ہے۔ چونکہ یہ دونوں مقبرے صرف چونے کے بنے ہوئے تھے۔ اب بالکل خستہ حالت میں ہیں۔ گو برٹش حکومت کی طرف سے آثار قدیمہ کا لحاظ کرکے ان کی مرمت ہوتی رہتی ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی دلچسپی اور رونق نہیں ہے۔ ہاں تیسرا مقبرہ جہاں شہنشاہ ہند جہانگیر آرام فرما رہے ہیں خالص سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے مقبرے کے وسط میں سنگ مرمر کا مزار ہے جس پر بیش قیمت پتھروں کی پچی کاری کی ہوئی ہے۔ اس کمرے کے چاروں طرف سنگ مرمر کے دالان ہیں جن میں نہایت نفیس جالی کٹی ہوئی ہے۔ چاروں کونوں پر چار سفید پتھر کے منارے ہیں اور مقبرہ کی چھت بھی جو بہت بڑی اور سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے پچی کاری سے خالی نہیں ہے مقبرہ کے باہر ایک چھوٹا سا خوشنما باغ ہے۔

دو بجے سے پہلے میں شاہدرہ سے واپس آیا۔ ٹھیک تین بجے کھتری کانفرنس

سنٹرل کمیٹی لاہور کا ڈیپوٹیشن آیا جس میں منجملہ اور معزز ممبران کمیٹی کے آنریبل رائے بہادر رام سرن داس پریزیڈنٹ سنگم لال وائس پریزیڈنٹ اور رائے صاحب سانجی مل سکرٹری تھے۔ پریزیڈنٹ صاحب نے ایک مطبوعہ اڈریس پیش کیا جس کی نقل یہ ہے:-

"بخدمت بابرکت راجۂ راجان مہاراجہ سر کشن پرشاد نرندر بہادر جی، سی آئی، ای، یمین السلطنۃ حیدرآباد دکن۔

اے فخر قوم! ہم نیازمندان قائم مقامان کھتری باشندگان لاہور و ممبران کھتری کانفرنس سنٹرل کمیٹی لاہور جناب کی خدمت بابرکت میں بدیں غرض حاضر ہوئے ہیں کہ حضور والا کی اس پہلی تشریف آوری پر جملہ کھتریان لاہور کی طرف سے جناب کا برادرانہ خیر مقدم کریں۔

جناب والا۔ جب تک آسمان پر چاند اور سورج درخشاں ہیں زمین پر راجہ ٹوڈرمل وزیر مال شہنشاہ اکبر کا نام نامی روشن و برقرار رہے گا۔ شہنشاہ اکبر کی صلح کل اور امن پسند حکومت کا ذریعہ زیادہ تر راجہ صاحب ممدوح ہی تھے اور ہندو قوم بالعموم اور کھتری قوم بالخصوص راجہ صاحب موصوف کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی کیونکہ راجہ صاحب کی ہی تلقین و تحریص سے ہندو قوم اور اس کے مختلف افراد نے فارسی زبان کی تدریس شروع کی اور اس طرح سے سرکاری ملازمت کا راستہ اپنے لئے کشادہ کیا۔ راجہ صاحب کے خاندان میں سے رائے مول چند صاحب حیدرآباد دکن تشریف لے گئے اور وہاں وہ نام آوری

اور اقتدار حاصل کیا جو ہندوستان میں آفتاب کی طرح روشن ہے اور اسی خاندان کے نیر درخشاں جناب والا کے جد امجد راجہ چند و لعل صاحب آں جہانی کا نامِ نامی نہ صرف حیدر آباد دکن کی تواریخ میں ہمیشہ کے لئے یادگار رہیگا بلکہ تواریخِ ہند میں قابل عزت و وقار رہیگا۔

چنانچہ حضور والا کا خاندان جس طرح حیدر آباد دکن کے امرا میں درجۂ اول کا خاندان شمار کیا جاتا ہے اسی طرح اس خاندان کی نیک نامی، سخاوت اور دریا دلی شہرۂ آفاق ہے۔

پنجاب میں حضور کی تشریف آوری سے کھتریانِ پنجاب کو بے انتہا فخر حاصل ہوا ہے اور یہ فخر بالکل بجا ہے کیونکہ جس قدر قوم کھتری اس وقت تک بھارت ورش میں پائی جاتی ہے اس کا اصل مسکن بھی خطۂ پنجاب ہے۔ پھر اس وجہ سے کہ جناب والا کے وطن قدیم ہونے کا شرف نہ صرف پنجاب کو حاصل ہے بلکہ ضلع لاہور کا موضع چونیاں اس شرف کا خاص مستحق ہے کھتریانِ لاہور فرطِ مسرت سے جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اور یہ سلطنت انگریزی کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے کہ آج دو صدیوں کے بچھڑے ہوئے بھائی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں اور ایک ہار کے بکھرے

ہوئے موتی از سرِ نو تار میں پروئے جاتے ہیں۔ یعنی جناب والا دو صدیوں کے بعد اپنے اصل مسکن میں تشریف لائے ہیں اور آپ کے برادران آپ کو دلی مسرت سے خیر مقدم کہتے ہیں۔

حضور والا! آپ جیسے فخرِ قوم کا ممبرانِ قوم میں جلوہ افروز ہونا قوم کی بہتری کی دلیل ہے اور ہم فدویان قیاس کرتے ہیں کہ اب کھتری قوم کے دن پھرنے کو ہیں اور صدیوں کا ادبار اس سے دور ہونے والا ہے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ حضور والا کو اپنی پیاری قوم سے دلی محبت ہے اور حضور کو قوم کی بہتری اور بہبودی کا خیال ہر دم رہتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی کھتری کانفرنس سنٹرل کمیٹی کو جناب کے مشورہ کی ضرورت ہوئی ہے۔ جناب نے ہمیشہ اپنے نیک مشورہ سے اس کی امداد فرمائی ہے۔

اس موقعے پر ہم فدویان مناسب خیال کرتے ہیں کہ کھتری کانفرنس کے متعلق چند امور جناب والا کی خدمتِ بابرکت میں عرض کریں۔ کھتری کانفرنس کی بنیاد محض اس غرض سے رکھی گئی تھی کہ کھتری قوم کے دور افتادہ افراد کو ایک جا کیا جائے اور جو اسباب اس وقت اس کی یگانگت کے مانع ہیں ان کو رفع کر دیا جائے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ کھتری قوم کو اس امر کا فخر بجا ہے کہ یہ ان بہادر راجگان مہاراجگان کی اولاد ہے جن کا نام نامی ہندو تواریخ کے آسمان پر ہمیشہ آفتاب کی طرح درخشاں ہے اور رہیگا۔ لیکن شومی طالع سے قوم کی حالت صدیوں سے بگڑ چکی اور اس وقت

اس کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ کھتری کانفرنس کی مقدم غرض کھتری قوم میں یگانگت کا پیدا کرنا اور کھتری قوم کے ادبار کو دور کرنا ہے۔ کھتری کانفرنس کے آج تک نو اجلاس مختلف مقامات پر منعقد ہو چکے ہیں۔ ہم فدویان کو دلی افسوس ہے کہ بوجہ کثرتِ کار وبا ودیگر بواعث کے حضورِ والا نے اس وقت تک کسی اجلاس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق نہیں بخشی۔ جناب والا کو غالباً یاد ہوگا کہ ۱۹۰۲ء میں جب شہنشاہِ معظم ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کا دربار تھا اور حضور والا دہلی تشریف فرما ہوئے تھے تو ہم نیاز مندان جناب والا کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوئے تھے لیکن بوجہ حضور والا کی مصروفیتِ کار کے کانفرنس کو فخر قدوم حاصل نہ ہوا۔ تاہم حضور نے اپنی ہمدردی کا اظہار واضح طور پر کر دیا۔

کھتری کانفرنس کے مقاصد کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور مقاصد کی انجام دہی بھی کچھ آسان نہیں کیونکہ صدیوں کے نقصانات اور جہالت کو دور کرنا ایک روز کا کام نہیں۔ کانفرنس کو اگر ضرورت ہے تو صرف ایسے کھتری بزرگوں کی ہے جو اپنی نیک اور پختہ کار صلاح سے اُسے درست راستہ پر چلا سکیں اور قومی بہبود و اصلاح کی تجاویز سوچنے اور اُن کو زیر عمل لانے میں اُس کی امداد کر سکیں۔ کانفرنس کے پاس صرف ایک اوپدیشک ہے جو بلحاظ اس کی وسعت کار کے کافی نہیں ہے۔ امداد بہبودگان و تعلیم و تربیتِ یتیمان و نوجوانان کا کام نہایت وسیع ہے لیکن بوجہ کمی سرمایہ اُن کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جا سکتی۔ کانفرنس کی مالی حالت تسلی بخش نہیں ہے اور جو کچھ اس کی گزران

ہے وہ صرف اُس عطیہ ماہوار پر ہے جو اس کو حضور مہاراجہ صاحب بہادر بردوان کی سرکار سے مرحمت ہوا کرتا ہے۔

اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ بقول حضور والا "ہماری قوم کیا بلحاظ تموّل اور تعداد کے اور کیا بلحاظ اولوالعزمی اور ہمتِ مردانہ کے براعظم ہندوستان میں گھٹی ہوئی نہیں ہے" لیکن افسوس تو اس امر کا ہے کہ مدبّران اور اکابرِ قوم نے ابھی تک ادھر توجہ نہیں فرمائی۔

حضور والا کی موجودگی سے ہم فدویان کو اُمید ہے کہ مُردہ روحوں میں جان آجائیگی۔ اگر حضور والا نے تھوڑی سی بھی توجہ اِدھر مبذول فرمائی تو ڈوبی ہوئی ناؤ ساحلِ مُراد پر پہنچ جائے گی۔

ہم نیازمندان ایک بار اور حضور والا کو اس تشریف آوری کے موقعے پر خیر مقدم کہتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ حضور والا اپنے وطن قدیم کو بھول نہ جائینگے اور اُس کی بہتری و بہبودی کے لئے اور آپ کے اس موقعے کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک مستقل نشان چھوڑ جائیں گے۔

ہم ہیں: آپکے نیازمندان کارپردازان سنٹرل کھتری کانفرنس کمیٹی	آنریبل رائے بہادر رام سرنداس پریزیڈنٹ سنگم لال وائس پریزیڈنٹ رائے صاحب جنرل سکرٹری

چونکہ وقت بہت کم تھا مجھے اُس عظیم الشان جلسہ میں بھی جانے اور تقریر کرنے کے لئے تیار ہونا تھا جو میرے دوست آنریبل رائے بہادر رام سرنداس نے ہریکشن تھیٹر ہال میں منعقد کیا تھا لہٰذا اس اڈریس کا جواب مختصر الفاظ میں احباب کی مہربانی اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرکے اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد سے اتفاق و ہمدردی ظاہر کی اور اُس کے تفصیلی جواب کو جلسہ کی تقریر پر منحصر رکھا۔

۶ ½ بجے میں اپنے بعض معزز احباب کی معیت میں غبارؔ صاحب اور دو خدمتیوں کے ساتھ تھیٹر ہال میں گیا۔ یہ ہال بڑے سلیقہ سے سجایا گیا تھا اور حضار سے بھرا ہوا تھا۔ جس میں ہندو مسلمان شرفا و معززین نے اپنی اخلاقی مہمان نوازی میں حصہ لیا تھا۔ ہال میں میرے پہونچنے پر احباب نے چیرز کے ساتھ اپنی اظہار مسرت اور یگانگت کا ثبوت دیا۔

ڈاکٹر سر پرتول چند رچٹرجی نے آج بھی بہ حیثیت صدر اپنی افتتاحی تقریر میں باشندگان لاہور کی طرف سے پنجاب میں میرے آنے پر گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ان کے بعد آنریبل رائے بہادر رام سرنداس و ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا و مسٹر اکبر عمر بیرسٹرایٹ لا و آغا حشر کاشمیری و جالبؔ صاحب جائنٹ اڈیٹر پیسہ اخبار نے نہایت جوش اور سنجیدگی کے ساتھ پُر معنی تقریریں کیں اور ہر اک نے اپنے حسن ظن کی میرے خاندانی اعزاز و خدمات و خطابات پر روشنی ڈالی ان کے بعد مشہور فصیح البیان پنڈت دین دیال شرما نے ایک زبردست اور موثر الفاظ میں تقریر کی

اور میری محبت کے جوش میں اُن اعتراضوں کا کافی جواب دیا جو بعض پرچوں نے اپنی تنگ دلی سے میری نعت گوئی پر وارد کئے تھے اور میرے مذہب اور مشرب پر معترض تھے۔ بعد ان سب کے میں اپنے احباب اور ہندو مسلمان بھائیوں کی خدمت میں کھڑا ہوا اور ان اسپیچوں اور تقریروں کے جواب میں جو تقریر کی وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

"معزز حضرات!

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

(۱) سب سے پہلے میری یہ عرض ہے کہ مجھے آپ صاحبوں کے روبرو کچھ کہتے ہوئے حجاب آتا ہے۔ "حکمت بہ لقمان آموختن" والی مثال اظہار مدعا کی جرأت نہیں دلاتی تاہم محض محبت کی وجہ سے اپنے خیالات کو جو میرے قلب اور دماغ میں امانت ہیں بے تکلفانہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

(۲) اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ میرے خاندان کو گولا ہوری ہونے کا فخر حاصل ہے، لیکن میری خاص پیدائش حیدرآباد دکن کی ہے۔ اس لئے میری زبان کیا اور میں کیا۔ عرض حال میں اگر کسی قسم کی غلطی زبان یا محاورہ کی ہو جائے یا جوشِ مسرت اور بے تکلفی کے باعث کوئی لفظ گستاخانہ منہ سے نکل جائے تو بمصداق؎

بر من مگیر بر کرمِ خویش نگر

معاف فرمایا جاؤں۔

(۳) آپ بھائیوں نے براہ محبت اس فقیر کی مسافر نوازی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا جو میرے لئے باعثِ فخر ہی آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ میرے خاندان کا سلسلہ راجہ ٹوڈرمل وزیر مال شہنشاہِ اکبر سے (جن کی لیاقت اور قابلیت اور مدبری کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہی) چلا آتا ہی۔ اس کے بعد میرے جدّ اعلیٰ مہا راجہ چندو لعل لاہوری کا نام آتا ہی جو آصف جاہی کہلاتے ہیں۔ پس سمجھ لینا چاہیئے کہ پانسو برس سے میرا خاندان مسلمان تاجداروں کی نمک خواری کا شرف رکھتا ہی۔ اگر میں اپنی خاندانی موروثی نعمت کو یعنی مالک اور ملک کی خیر خواہی اور وفاشعاری اور آقا پرستی کو نہ نباہوں تو ظلم ہی اور اس آئین وفا کے خلاف ہی جس کی پابندی میرے آباؤ اجداد کے لئے ہمیشہ سے سرمایۂ افتخار رہی ہی۔

بیشک (کھتری النسل) سپاہی نژاد ہوں لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا میرا مذہب صوفیانہ رہا میرا ایمان توحید اور مشرب صلح کل رہا ہی۔ اور انشاءاللہ رہے گا ؎

بریں زیستم ہم بریں بگزرم

مجھے اسلام کے ساتھ اس لئے اُنس ہی کہ میں سچے دل سے اپنے ملک اور مالک سے محبت رکھتا ہوں اور جب تک زندہ ہوں انشاءاللہ تعالیٰ رہوں گا میرا تعلق ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی جیسا کہ جسم کا تعلق روح کے ساتھ اور

روح کا تعلق جسم کے ساتھ۔ اگرچہ بعض احباب میرے طریق زندگی کو بہ نگاہِ استحسان نہیں دیکھتے رہے لیکن میں ان حضرات کو معذور سمجھتا ہوں۔

جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

میری یہ باتیں اگر پسند نہ آئیں تو مجذوب کی بڑ سمجھکر معاف کیجئے۔

(۵) جو احسان مجھ پر اس غریب الدیاری میں آپ کی جانب سے ہوئے ان کی سپاس گزاری محال ہے۔ لیکن بھائیو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ صرف مجھ ایک فقیر کی مسافر نوازی سے ملک اور اس کے باشندوں کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اہل ملک آپس میں اتفاق اور ایک دوسرے کی عزت اور سچّی ہمدردی اختیار نہ کریں۔

اب میں اپنے بھائیوں کی خدمت میں اس طول کلامی اور سمع خراشی کی معافی چاہکر خدا حافظ عرض کرتا ہوں اور پھر اس فقرہ کو دوہراتا ہوں کہ یار زندہ صحبت باقی۔ خدا ایسا وقت بہت جلد لائے کہ مجھے اپنے بھائیوں اور احباب کی خدمت گزاری کا شرف حاصل ہو۔

یہ امر آپ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہم لوگوں کی روزانہ اور ہر وقت یہ تمنا رہتی ہے کہ چار عناصر میں اتفاق رہے جس سے وجود کی سلامتی میں برہمی نہو اور جب کسی عنصر میں اختلاف ہوا توراً ہم اس کی اصلاح کی طرف ڈاکٹروں اور حکیموں سے

رجوع کرتے ہیں۔ ہم اپنے گھر میں روزانہ اپنی بی بی اور بچّوں اور خویش واقارب کو اتفاق سے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے کہ آپس کی نااتفاقی گھر کی بربادی کا سبب نہو مگر افسوس ملک اور حکومت کی حفاظت و استحکام کے لئے ہندوستان کی مختلف قومیں آپس ہی میں اتحاد نہیں کرسکتیں جس کی ملک کو اس وقت سخت ضرورت ہے

پس اے برادرانِ پنجاب! اپنے خیالات اور طرزِ عمل میں اصلاح کرو اور آپس میں ایسا زبردست پیمان باندھو جو کسی قوی سے قوی انقلاب سے بھی متاثر نہو سکتا ہو اور جو اس عالمِ کون و فساد کے مصافِ پیہم میں آپ کے لئے باعث قوت و استحکام ہو۔ میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا کا ایک شعر ہے:

نظارۂ کہکشاں نے مجکو عجیب نکتہ یہ کل سمجھایا
ہزار گردش رہی فلک کو مگر یہ تارے بہم رہے ہیں

بھائیو! آپنے اس مبارک اصول زندگی کو محض معمولی اغراض کی خاطر ہاتھ سے دیدیا جس کی وجہ سے ہندوستان کے عام انسانی برادری کا شیرازہ کھل گیا اور ایک ہی سرزمین کے پیدا ہونے والے ایک ہی زبان بولنے والے ایک ہی طریق پر زندگی بسر کرنے والے ایک ہی حکومت کے سایہ میں رہنے والے باوجود اتنی باتیں مشترک ہونے کے ایک دوسرے کے لئے اغیار و اجانب ہوگئے یہاں تک کہ دیرینہ شکایت و رقابت کا دفتر کھولا گیا اور مغائرت کی خلیج کو وسیع تر کردیا گیا لیکن بقول اقبال

چمن میں اے ہمصفیر اگلی شکایتوں کی حکایتیں کیا — خزاں کا دورہ ہے گلستاں میں تو رہا یہ کہ ہم رہے ہیں

یہ زمانہ جب کہ برٹش راج کا ہم سب کے سر پر سایہ ہے ہمارے لئے نہایت ہی غنیمت ہے ہم سب کو اس کی قدر کرنا چاہیئے اور اس صلح کل حکومت کے فیوض سے متفق ہو کر بہرہ اندوز ہونا چاہیئے۔

اَب میں اپنے ان معزز احباب کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے حضرت محمد مصطفےٰؐ کی نعت کرنے کی وجہ سے میرے موحدانہ وصوفیانہ کیرکٹر پر حملہ کیا ہے پہلے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں نشانۂ اعتراض بنایا آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ یہ اخلاق ہی کی خوبی ہے کہ آپس میں کسی ہندو اور مسلمان کی دوستی اور یک جہتی ہو جاتی ہے تو کس قدر بے تکلفی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے اعزا و اقارب کی دل سے عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے یہیں آکر یہ بات سُنی کہ اب تک شادیوں کے موقعے پر یہ دستور ہے کہ لڑکی والوں کی طرف جو مہمان آتے ہیں وہ اپنے میزبان کے پاس کھانا نہیں کھاتے اس کا اصلی مقصود یہ ہے کہ گویا اپنے دوست کی لڑکی کو اپنی لڑکی سمجھتے ہیں اور جس قدر مہمان شریک ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو گویا اس لڑکی کے عزیز و قرابت دار سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ کس قدر حسنِ اتفاق اور یک جہتی کا ثبوت ہے۔

مگر وائے برحال ما کہ دنیوی اغراض کے لئے تو ہم اتفاق کو اس قدر فروغ دیں اور اکابر ادیان اور پیشوایانِ مذاہب کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آئیں جھول

مقاصد اور اغراض پورے ہونے کے لئے ہم بلاتعین ملت و مذہب ہر افسر اور ہر عہدہ دار اور حاکم اور بادشاہ کی عزت اور عظمت کریں ان کے قوانین کو اپنے شرعی قوانین کے برابر جگہ دیں۔ اس پر عمل کریں اور ان کی خوشنودی کو خدا کی خوشنودی اور سعادتِ دارین سمجھیں مگر اکابر اور رسل اور ہادیان و پیشوایانِ مذاہب کی تعظیم کو باعث تباہی ایمان اور بربادی دین اور خرابیِ اخلاق سمجھ کر اپنے کو خدا کا معتوب بنائیں۔

کیا اُن پیشوایانِ مذاہب اور مرسلانِ ملت کی عزت افسر اور حکام سے بھی گئی گزری ہوئی!

جب آپ اپنے دوست کی خاطر اس کے اعزا و اقارب کی عزت و تعظیم کرتے ہیں تو کیا اخلاق اس امر کا مقتضی نہیں ہے کہ آپ اپنے دوست کے اکابر دین و پیشوایانِ مذہب کی بھی تعظیم کریں؟

کیا ان اکابرِ دین کا رتبہ آپ کے دوست کے اقارب سے بھی کم ہے؟

نہیں نہیں! اے خدا کے ماننے والے ہندو اور مسلمانو!! صرف خدا کو ایک کہنے سے موحد نہیں کہلاؤگے بلکہ حقیقی توحید یہ ہے ؎

واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

اے بھائیو! سب کو ایک سمجھو اور ایک جانو۔ ایک دیکھو جس طرح تم اپنے دوست کی خاطر اس کے بچوں کو اپنے عزیز اور اس کے رفقا اور اس کے دوستوں کو اپنے دوست سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو اور اس کی خوشنودی کو اپنی خوشنودی اور

اُس کے غم کو اپنا غم اور اُس کے رنج کو اپنا رنج سمجھتے ہو اور شادی و غم دونوں حال میں اُس کے شریک ہوتے ہو اسی طرح آپس میں سب کے ساتھ یہی برتاؤ رکھو اور سب کے پیشوایان مذہب کی وہی عزت کرو جیسے کہ تم اپنے ایک دوست کے بزرگوں کی عزت و تعظیم کرتے ہو۔

اے بھائیو! اگر آپ ایک دوسرے کے بزرگوں کی عزت و تعظیم کو اپنا اصول زندگی نہیں ٹھہرا سکتے تو تمھاری تعلیم سے کیا اخلاقی فائدہ نکلا؟ تعلیم کا مقصد نرا روٹی کمانا نہیں بلکہ اس کی اصلی علت غائی اخلاقِ حسنہ ہے جس سے انسان کی زندگی میں اطمینان و سکون پیدا ہوتا ہے اور انسانی روح کا آئینہ ہر قسم کے زنگ سے مجلّا و مصفّا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نہیں تو تعلیم بے سود۔ لکچر بے سود، اور بڑے بڑے مدعیانِ اصلاح کی تقریرین بے سود اور رزولیوشن بے سود۔ تعلیم کو ٹھیک راستہ پر چلاؤ تاکہ اُس سے اخلاق حسنہ پیدا ہوں اور بچوں میں اس محبت اور یگانگت کی روح پیدا کرو جو تمھارا آبائی مشرقی خاصّہ ہے تاکہ ہم دُنیا کی اقوام میں مطعون نہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ پنجاب میں تعلیم روبہ ترقی ہے اور یہاں کے لوگ انگلستان کے فیض جاریہ سے مستفیض ہو رہے ہیں البتہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ پرائمری تعلیم کی ابھی اس صوبہ میں کمی ہے جو اس صوبہ کے نکتہ دانوں کی نگاہ سے مخفی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کمی جلد پوری ہو جائے گی۔ لیکن میں اس قدر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ پرائمری تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم اور اس ملک کی قدیم صنعتوں کی حفاظت کی بھی

بہت ضرورت ہو ورنہ ہماری عجیب وغریب صنعتیں جو کبھی دیگر اقوام کے لئے سرمایۂ حیرت واستعجاب تھیں اور اب بھی ہیں نیست ونابود ہو جائیں گی۔ بہرحال علوم قدیمہ وجدیدہ سیکھنے میں ہم کو خذ ما صفا ودع ما کدر کو عمل میں لانا چاہیئے اور اپنے بزرگوں کی طرح سفر دور دراز سے جواہر زواہر علوم کو فراہم کر کے اپنا ملکی خزانہ بھرنا چاہیئے۔ اور اپنے شہنشاہ اور ملک کے کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو ہر وقت ہر طرح سے مستعد بنانا چاہیئے میں نے نہایت صفائی اور بے تکلفی سے اپنے دلی جذبات اور دوستانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے بڑا وقت دیا اور اپنی توجہ سے میرے خیالات کو سُنا۔

اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں اگرچہ بظاہر میرا وجود آپ سے دور رہیگا۔ مگر روحانی تعلقات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے ؎

دیدۂ سعدیؔ و دل ہمراہ تست

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

جو کچھ آپ صاحبوں کے خدمات مجھ سے ہو سکیں گے حتی الامکان ان خدمات کے بجالانے میں میری طرف سے انشاء اللہ کوتاہی نہ ہوگی اور یہ خدمت گذاری میرے لئے ہمیشہ سرمایۂ افتخار و ناز رہیگی۔ میرے غیاب میں خدائے تعالیٰ مجھے یہ خوش خبری سُنا کر دل شاد کرے کہ یہاں کی کُل اقوام شیر وشکر کی طرح یگانگت سے زندگی بسر کر رہی ہیں اور ایکایت کی برقِ تجلّی سے دوئی کا خرمن جل کر خاکستر ہو جائے۔

اَب میرا سلام و نیاز قبول فرمائیے۔ خدا حافظ عرض کرتا ہوں یار زندہ صحبت باقی بھگوان نے چاہا تو ضرور کبھی کبھی اپنے ہموطن بھائیوں کی ملاقات سے شرف حاصل کرنے کے لیے ضرور یہاں تک سفر کیا کرونگا پرماتما اس ارادہ کو پورا کرے"۔

چونکہ میں نے مذکور تقریر کو بہت وضاحت کے ساتھ تحریراً مرتب کیا تھا مگر وقت تنگ ہونے کے باعث مختصر کر دیا۔ جس قدر حصّہ فروگذاشت رہا وہ ضیافت طبع ناظرین کے لیے درج ذیل ہے۔

" **حضرات** ۔ ترقی علی العموم شخصی ہو یا قومی بہر حال ایک امر اضافی ہے اور تمام دُنیا بلکہ تمام عالم کے اسباب پر موقوف ہے جن میں بہت سے ایسے ہیں کہ انسانی قبضۂ قدرت سے باہر ہیں۔ مثلاً دنیا میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ آب و ہوا پر اختیارِ کلّی رکھتا ہے حالاں کہ جسمانی صحت کا مدار آب و ہوا پر ہے اسی طرح اور دوسرے اجرام فلکی کا اثر اس کرۂ زمین پر معلوم نہیں کہ کیا کیا ہے اور انسانی وجود اِس سے کس قدر متاثر ہے۔

چونکہ دُنیا عالمِ اسباب ہے اور ہر شخص فعلاً اِسی کا قائل ہے کہ اُس کے اُمور اُس کی دماغی تدبیروں پر منحصر ہیں انسان نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے اُن ایجادات و اختراعات کا سرمایہ بہم پہونچا لیا ہے جن کا قبل از وقوع وہم و گمان بھی نہ تھا۔ لہذا اسبابِ ترقی کی تشخیص اور جستجو ایک امر لازمی اور ضروری سمجھی جاتی ہے۔

مگر اِن اسباب اور اُن کے ذرائع کی روشنی سے وہی شخص کسبِ ضیا کریگا جو قومی ترقی کو اپنی اقبال مندانہ کامیابی کا جوہر سمجھے گا۔ اور جو اِس امر کو منصبی خدمت تسلیم

کرلے گا کہ بنی نوع کے ساتھ ہمدردی کرنا گویا قانونِ قدرت کی تقلید کرنا ہی۔

اس وقت ہندوستان میں تینتیس ۳۳ کروڑ آدمی ہیں جو مختلف المذاہب و مشاغل ہونے کے اعتبار سے بھی انسانی نوعیت کے لحاظ سے ایک ہی کتاب کے اوراق تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ مگر دنیاوی ترقی میں ہم کو مایوس ہوجانا پڑتا ہی جبکہ اپنی قوم میں اُن مصلحانِ قوم کی تعداد میں کمی پاتے ہیں جو دُنیاوی ترقی میں ہمارے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرسکیں۔ اگرچہ مجھے اِس اِنکارِ محض سے بھی اپنی کوتہ نظری کا اقرار کرنا پڑے گا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ قومی ترقی سے شخصی ترقی کو ایک حد تک ترجیح بلا مرجح سمجھ لیا گیا ہی ایسے شخص فی صدی پانچ بھی شاید ہی نکلیں جو اپنی کامیابیوں کا اپنی درماندہ قوم پر بھی کچھ اثر ڈال سکیں۔

معزز حضرات!

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

زمانہ کے تغیرات عام طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ باعتبار ہر قوم اور ہر ملت کی ترقی و تنزل کے یہ دُنیا آئے دن تبدیلیوں کا اکھاڑا ہی۔ جس میں مہذب اور غیر مہذب دونوں طاقتیں اپنے اپنے یادگار اور برآوردہ کارناموں کے آئینے دکھا رہی ہیں مگر ہم یہ دیکھنا چاہتی ہیں کہ گزشتہ یا بعض موجودہ ترقی یافتہ قوموں نے کونسے ایسے ذرائع اپنی تجربات کی دماغی قوت سی بہم پہونچائے اور کن ایسے وسائل

سے ترقی میں کامیابی حاصل کی جو بلحاظ زمانہ کی رفتار کے اس کے واسطے ہر طور پر مفید ثابت ہوئے۔ غائر نظر ڈالنے پر کتنے ہی ایسے اسباب پر نظر جاتی ہی جن پر قومی ترقی کا انحصار ہی مگر میں ان سب سے قطع نظر کرکے ان دو سببوں کو پیش کرتا ہوں جو عام خیالات کو مقناطیسی قوت سے اپنی طرف کھینچتے ہیں جن میں پہلا اتفاق ہی اور دوسرا علم۔

اتفاق ۔ محتاج صفت نہیں انسان فطرتاً اس کا محتاج بنایا گیا ہی۔ اگر ایک آدمی چاہے کہ وہ تن تنہا رہ کر اپنے حوائج کے دشوار گذار مرحلے طے کرے تو ایک دن بلکہ ایک ساعت بھی اس کو اپنی زندگی کے لالے پڑ جائیں حکیم علی الاطلاق نے اس اتفاق کا سبق ابتدا ہی سے تعلیم کرنے کے لئے انسان کو اپنی وسیع اور غیر محدود قدرت سے ایسی حیثیت پر ایسے عالم میں پیدا کیا ہی کہ منافق سے منافق کو بھی کم سے کم دو دو ڈیڑھ برس مرضعہ اور اس کے بعد شباب کی جنوں خیز سرحد پر پہونچنے تک اپنے دوسرے محبت جتانے والوں سے محبت رکھنا پڑتا ہی اور اس مدت میں انسان پر اپنے محتاج استعانت ہونے اور اتفاق کے نازک مسئلہ کو ایک امر قابل التسلیم واجب العمل سمجھنے کی ضرورت بخوبی ظاہر ہو جاتی ہی۔ سن تمیز کو پہونچکر (بشرطیکہ وہ قدرتی طور پر ایسے عقلی زیور سے آراستہ ہو جس کی روشنی میں وہ اُن چیزوں کو امتیاز کر سکے جو اس کے آرام و آسایش کے لئے دنیا کی گئی ہوں) اس پیچیدہ اور نازک مسئلہ کو حل کر سکتا ہے کہ انسانیت کا شیوہ اختیار کرکے انسان تن تنہا دنیا میں ہرگز نہیں رہ سکتا۔ مرتبہ کمال کو پہونچنا اور احتیاج انسانی کا بہم پہونچانا ہر نوع انسان

کو قائم رکھنا تو درکنار تمہارہ گروہ اپنی عزیز جان بھی چند منٹ تک محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مگر چونکہ یہ امر زیادہ تر قابل غور و لحاظ ہی کہ یہاں مختلف اقوام و مذاہب اور ایسے متناقض و متخالف اغراض و مقاصد کے لوگ پائے جاتے ہیں کہ اُن میں باہمدگر اتفاق کا ہونا اِس زمانہ میں تو دشوار اور آئندہ کے لئے بھی ایک سخت مشکل ہی ہندو مسلمان۔ پارسی۔ یہودی اور اُن کے بے شمار طائفے اور قبیلے اور ہر ایک قوم کے بیشمار مذاہب اور ہر مذہب کے لاتعد و لاتحصے مشاغل و مطالب اور پھر بوجہ اُس عام آزادی کے جو اس وقت ہر شخص کو قانوناً بدرجہ مساوی دی گئی ہی ہر متنفس کو ہر امر میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اور سینہ بہ سینہ چلنے کی خواہش ہی پھر اس صورت میں اتفاق کی گتھی کیوں کر سلجھ سکتی ہی اور کیوں کر یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہو سکتا ہی۔

ایسی حالت میں اتفاق پیدا کرنے کا اصل طریقہ اگر کسی کے امکان میں ہی تو سب سے پہلے انجمنوں۔ سوسائٹیوں۔ کلبوں کا قائم کرنا ہی۔ ان کے قائم ہو جانے پر جو اُمور سب ہی مقدم اور ضروری ہوں اور جن کی درستی و اصلاح آبادی کے کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہو موضوع اتفاق قرار دی جائیں اور جب اِن میں سے کسی ایک موضوع کے ذریعے سے کسی ایک یا چند امرائے جماعت کے ذریعے سے جو اسی طرح ہر ہر فرقہ کے لوگوں میں پیدا ہو جائیں گے اور جن کو اپنی قوم یا قبیلے کے عام لوگوں کے ہر ایک ضروری امر کے بیان کرنے کا آسان اور سہل ذریعہ حاصل ہوگا۔ اور

عام اتفاق کی کامل کوشش ہو سکے گی۔ اگر عام اتفاق کی موضوعات میں ان لوگوں کے فوائد متصور ہوں گے تو یقین ہی کہ ان میں اکثر اتفاق پر مائل ہونے کا موقع پائیں گے اور جس کام کو وہ کرنا چاہیں گے گو وہ کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو نہایت آسانی کے ساتھ انجام دے سکیں گے۔

اگر اس پر بتدریج عمل کیا جائے تو ممکن نہیں کہ قومی اتفاق کا ستارہ اُسی اوج وارتفاع پر نہ آجائے جس پر اور قومیں بلند پروازیاں دکھاکر ترقی کے مدارج طے کر رہی ہیں۔ ہاں اگر ہم ہی اپنی ناعاقبت اندیشی سے اس کو خیال میں نہیں لاتے تو ضرور ہی کہ کسی ایسے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں جس کی بدنمار نگت ہماری ہستی کے لئے ادبار کا جامہ ہوتی جاتی ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار

چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

دوسرا سبب تعلیمی ترقی ہی جس کی کمی نے ہماری قومی سوشیل وتمدنی حالت کو خراب کر رکھا ہے۔

دنیا میں کتنی تبدیلیاں ہوئیں۔ کس کس طرح کے فیشن اختیار کئے گئے کس کس رنگ کی ایجادوں سے دنیا کو آراستہ کیا مگر ایک علم ہی وہ غیر محدود اور مستقل ترقی ہی جس کی وسعت زمانہ کی رفتار کے پہلو بہ پہلو بڑھ رہی ہی۔ تمام ایجادات وصنائع بلکہ ہر قسم کی دُنیاوی اقبال مندیوں کا انحصار اسی ترقی پر ہی اور ہر ملّت کی ترقی کے واسطے ہندوستان کے ہر حصّہ میں اسی کا مایوسانہ راگ گایا جا رہا ہے۔

جس ملک یا جس قوم پر علوم کے آفتاب کے چمکیلی شعاعوں کا پُرنور عکس پڑا ہی اُس نے اپنی روشن دماغی سے تہذیب۔ شائستگی۔ ہمدردی۔ حُب الوطنی۔ صلح پسندی۔ ارتباط قومی یا مختلف اقسام کی صنعت۔ حرفت۔ تجارت۔ زراعت وغیرہ میں اپنے مدّمقابل ملک وملّت سی گوئے سبقت لے جاکر آئے دن کی روزافزوں ترقیوں میں امتیاز حاصل کرلیا ہے۔

علم ہی وہ شجر ہے جس کی سرسبز اور شاداب شاخوں میں دنیاوی ہر طرح کی کامیابی کے خوشنما میوے لدے ہوئے ہیں۔ مگر ہندوستان کی آب وہوا اس سدابہار درخت کے لئے کچھ ایسی ناموافق ہوگئی ہی کہ بجائے نشوونما پانے کے اُس کی ہری ہری ڈالیاں بدشوقی وکاہلی کے تیز جھونکوں سے روز بروز مرجھائی جارہی ہیں۔ علم ہی ایک ایسا ناپیداکنار دریا ہی جس کی تہ میں سیویلزیشن اور تہذیب کے لاکھوں بلکہ کروڑوں چمکدار موتی پڑے ہیں لیکن یہ دریا اپنا نشیب چھوڑ کر کہاں سے کہاں پہونچا اللہ اللہ ہند سے یورپ پہونچا اور کن پرجوش لہروں سے وہاں کے جہل ونفاق کو بہائے لئے جارہا ہی۔ ہندوستان کا پچھلا علمی چرچا ایسا نہیں ہی جس کو زمانہ اپنی صدیوں کی گردش میں بھلاسکے۔ اِسی دریا کے پانی کی تاثیر سے گذشتہ زمانہ میں کیسے کیسے علمائے متبحر گذر گئے جو افتخارِ قوم اور سربرآوردہ ملک وملّت سمجھے جاتے ہیں اور جن کی روزافزوں ترقیوں سے ملک کی تہذیب وشائستگی میں چار چاند لگ گئے تھے وہ ترقی تھی جس کی بدولت ہندیوں نے جبرومقابلہ میں مصریوں یونانیوں کو شرمایا۔

منطق اور فلسفہ میں کوس لِمَنِ المُلک بجایا۔ وہ شائستگی تھی کہ مرد تو مرد عورتیں تک تربیت یافتہ ہوتی تھیں یا ایک یہ زمانہ ہے کہ مرد ہی اِس ناپیدا کنار دریا سے ہاتھ دہوئے ہوئے اور کنارہ کئے ہوئے ہیں تا بہ نسواں چہ رسد۔ اور ایسی حالت میں قومی یا ملکی ترقی کیسی! ؎

لگائے ٹھٹ کھڑی ہے نامرادی
تمنّائے دلی نکلے کہاں سے

تعلیم نسواں کی ضرورت قومی یا ملکی ترقیات کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اس تعلیم کا فائدہ عورتوں ہی تک محدود نہیں بلکہ اس آفتاب کی کرنوں کی جھلکیاں مردوں کی طرزِ معاشرت پر بہت کچھ پرتو ڈال کر فائدہ پہونچا سکتی ہیں۔ تربیت یافتہ بیوی اپنے شوہر کو ہر تیہ خوش رکھ سکتی ہے۔ ناخواندہ عورت دوستِ جاہل ہے۔

جو لوگ تعلیم نسواں کو معائبِ شرافت و مخربِ اخلاق جانتے ہیں۔ ہم اُن سے تین سوال کرتے ہیں۔

(۱) تعلیمِ نسواں شرعًا یا شاستڑا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) گذشتہ زمانے میں ہندو مسلمانوں میں تعلیم النسار کا رواج تھا یا نہیں؟

(۳) یہ تعلیم کب سے اور کیوں موقوف ہوئی؟

امر اوّل و دوم کی نسبت متفق اللفظ آوازیں آئیں گی کہ تعلیم نسواں ہرگز ناجائز نہیں ہے، بلکہ ہر مذہب و ہر ملّت میں حکم واجب کا رکھتی ہے۔ اگر

شرعی قانون عورتوں کی تعلیم کا حریف ہوتا تو گذشتہ زمانہ میں اہل ہنود و اہل اسلام کی وہ عورتیں جو مقدسہ سمجھی جاتی ہیں اور جو واقع میں اس لائق تقلید کہ اُن کے نقش قدم پر چلیں اور اُن کے چال چلن کو اپنا دستور العمل بنائیں علم و فضل سے ضرور محروم رہتیں۔ شرعی قوانین کو عام اس سے کہ مرد ہو یا عورت نہیں سمجھ سکتا جب تک اس کی دماغی تاریکی علم کی روشنی سے نورانی نہ ہو ؎

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

تعلیم نسواں کا رواج ہندوستان میں اس سبب سے کم ہوگیا کہ اہل ہند عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان رفتہ رفتہ کاہل ہوتے گئے اور عیش و عشرت میں پڑ گئے آج ہندو مسلمانوں کے شریف زادے اور شریف زادیاں دینیات سے محض بے خبر یہاں تک کہ اپنے مذہبی فرائض کے ادا کرنے میں بھی قاصر ہیں۔

عورتوں کو عموماً ناقص العقل کہا جاتا ہے مگر یہ الزام اُسی وقت تک ہے جب تک اُن کی تعلیم میں مزاحمت کی جاتی ہے اگر اُن کو تعلیم دی جائے اُس وقت مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ عورتیں ذہین ہیں یا مرد۔ اگر فی الحقیقت وہ ناقص العقل ہوتیں تو مدارس میں لڑکیاں ایسی ترقی نہ کرتیں جیسی کہ انھوں نے کی ہے تجربہ شاہد ہے کہ عورتیں مردوں سے ذہن و ذکاوت میں کسی طرح کم نہیں۔ صاحب ڈائرکٹر بنگال و مدراس وغیرہ افسران اعلیٰ کی رپورٹ سال تمام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدارس میں لڑکیوں نے نمایاں ترقی کی اور لڑکوں سے بڑھ گئیں۔ عورتوں کی

ناقص العقل اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کر لی جائے تو خلقی نہیں اُن کو تحصیل واکتساب فنون کی قابلیت حاصل ہی مگر اُن کو جابرانہ طریقہ سے روکا جاتا ہی تعلیم نسواں کے مزاحم یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ عورتوں کو تعلیم دینا اُن کی اخلاقی خرابیوں میں اُن کو مدد دینا ہی ماشاء اللہ کیا خوب اعتراض ہی علم و فضل پر بدگمانی کے ساتھ الزام لگایا جاتا ہی۔ کیا علم کا یہی خاصہ ہی کہ وہ اچھے کو بُرا بنا دے تعلیم نسواں کے فوائد میں پہلا فائدہ یہ ہی کہ عورت اگر تربیت یافتہ ہو گی تو اپنے بچّوں کو ابتدا ہی سے عمدہ تعلیم دے گی۔ اخلاق سکھائے گی۔ اوائل عمر میں جس قدر عمدہ تعلیم لڑکے اپنی ماں سے پا سکتے ہیں وہ کسی اور طرز پر ممکن نہیں اور یہ کچھ ضرور نہیں کہ نسواں علم برق میں براق ہوں جرّ اثقال سیکھیں تمام علوم کے دشوار گذار مرحلے طے کریں بلکہ اخلاق کی نادر کتابیں کفایت شعاری کے رسالے مطالعہ کریں مذہبی کتب معقول کو غور سے دیکھیں حساب و کتاب سے واقف ہوں گھر کا خرچ آسانی سے لکھ سکیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ابتدا ہی سے تعلیم دے سکیں جو اطفال کہ لائق اور تربیت یافتہ ماؤں کے کنار میں پرورش پائیں گے، بیشک وہ آگے چل کر اپنی تہذیب و شائستگی میں گوے سبقت لے جائیں گے کیونکہ کم سنی میں بچے اپنی ماں کی خو بو عادت رنگ ڈھنگ کا تتبع کرتے ہیں اور یہ خو بو بڑھ کر قریب قریب طبیعت ثانی کے ہو جاتی ہی۔

۲۵۔ جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۹۔ شہریور ۱۳۲۲ف	آج میں اول وقت مع اسٹاف ہندو ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور دو ایک اور انسٹی ٹیوشنوں کے دیکھنے کو گیا چونکہ آج

میں یہاں سے روانہ ہونے والا تھا، اس لئے سامان کے باندھنے کا حکم دیا اور
میں کہیں نہیں گیا۔ سات بجے شام کے میں تمام اسٹاف کے ساتھ اسٹیشن پر آیا۔ ڈبو
کا جو پہلے سے انتظام کیا جا چکا تھا اُن میں سوار ہو کر ۱۰½ بجے الہ آباد کو روانہ ہوا۔

۲۶ - جولائی ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲ - شہریور ۱۳۲۲ ف کو رکشیتر پر میری گاڑی پہونچی ڈبوں کے علیحدہ کرنے کا حکم دیا، ۹ بجے صبح کو زنانہ اسٹاف اشنان کو گیا۔ اور ایک بجے مع ہندو اسٹاف کے میں بھی اشنان کے لئے گیا۔

تھانیشر یا کورکشیتر سابق میں ایک بڑی سلطنت کا پایہ تخت تھا لیکن اب ویران و سنسان پڑا ہی۔ یہ مذہب ہنود کا نہایت مقدس و متبرک مقام ہے ہندوستان کے ہر حصّہ سے کثیر التعداد جاتری یہاں آتے ہیں مقدس تالاب جسے کورکشیتر کہتے ہیں، ریلوے اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلہ پر ہی تالاب کے وسط میں ایک مندر بنا ہوا ہی جو دیگر منادر سے زیادہ قدامت رکھنے کی وجہ سے نہایت قابلِ تعظیم سمجھا جاتا ہی ہر زمانہ و دور میں تھانیسر ہندوؤں کا بہت بڑا معبد رہا ہی اس میں جاتریو کی تعداد کہا جاتا ہی کہ بعض اوقات دس لاکھ تک پہونچ جاتی ہی ۱۶ - اپریل ۱۸۹۴ء میں سورج گرہن کے موقع پر ساڑھے سات لاکھ جاتری کی تعداد بتلائی گئی ہی زیادہ تر گرہن کے موقع ہی پر یہاں ہجوم ہوا کرتا ہی۔ ایک اور تالاب ریل کے پاس ہی ہے اسے سینا ہیت کہتے ہیں۔ اس میں گرہن کے وقت نہانے کا مہاتم بتلاتے ہیں۔ یہ دونوں تالاب کچّے ہیں اور برسات کے دنوں میں یہاں زیادہ پانی بھر جاتا ہی۔ کورکشیتر کے کنارے کئی مندر اور حویلیاں

بنی ہوئی ہیں جن میں راجاؤں کی طرف سے سدابرت جاری رہتا ہی۔ گھاٹ پکّے
بنے ہوئے ہیں اور پاس ہی استھانیشور مہادیو کا مندر ہی جس کے آگے ایک تالاب ہی
اس کے مقابل دُرگا کا مندر اور درگا کوپ ہی ان تالابوں کے ارد گرد بڑا بھاری میدان
ہے جن میں کورو پانڈوں کی مشہور گھمسان جنگ ہوئی تھی۔ اڑتالیس کوس کی گھیرے
میں کورو کشیتر کا تیرتھ مانا جاتا ہی اور یہاں ۳۶۰ تیرتھ بتلائے جاتی ہیں جن کے
مختلف مقامات پر مختلف نام رکھے ہوئے ہیں یعنی سال میں ہر روز ایک خاص جگہ
نہانے کا مہاتم سمجھتے ہیں اور بہت سے آدمی اس تمام حصّہ کی پرکما بھی دیتے ہیں یہاں
کے باشندے مُردوں کے است (ہڈی) ہردوار نہیں بھیجتے کیونکہ وہ اس کو اس سی
بڑا تیرتھ مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہردوار کاشی میں تو چارپائی پر مرے تو بھی مکت ہو جاتی ہی
اور یہاں خواہ سات منزل کی اوپر مرے تو بھی مُردہ سیدھا بہشت کو جاتا ہی یہاں پہلے دہ ہزار گھر
پنڈوں کے تھے مگر اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ تھوڑے فاصلہ پر یہاں شیخ چلی کا مقبرہ
قابل دید ہی۔ کورکشیتر کے سبجکٹ پر پانی پت اور الہ آباد کے زمانہ قیام میں میں نے ایک
مضمون لکھا تھا موقع اور مقام کی مناسبت سی ضیافتِ طبع ناظرین کے لئے پیش ہی۔

کورکشیتر

پڑا بتخانہ میں ہو یا طواف کعبہ کرتا ہو
یہاں کیا ہی وہاں کیا ہی کہیں ہو تیرا جویا ہو

آؤ چلو کورک شیتر آگیا ۔ اس کے بھی درشن کر لو یہ وہ رزمگاہ ہی جس سرزمین پر کورو پانڈوں نے اپنے دنیوی حقوق کے واسطے بڑے بڑے بہادر، سورما چکرورتی دوست عزیز قرابت داروں کا خون بہایا۔ ہم اس کی تفصیل وار ہسٹری بیان کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہمیں اس موقع پر تاریخی حالات کو صفحۂ قرطاس کے اسٹیج پر رزم گاہ کا تماشہ دکھانا مقصود ہی بلکہ اس سرزمین کے درشن کرنے کے وقت ہمارا دل ودماغ جن اثرات سی متاثر ہوا ہی اس کا کچھ مختصر حال بیان کرنا منظور رہی۔

ان بہادروں کے کارنامے مہابھارت کے لایق محقق مصنف نہایت خوبی سے لکھ کر یادگار چھوڑ گئے ہیں جو دنیا کی ہستی قائم رہنے تک اِن سیاہ حروف اور سفید کاغذ پر اپنا جلوہ دکھاتے رہیں گے۔ اور علم دوست محققین ۔ پنڈت ۔ عارف سنیاسی ۔ پرمہنس برہمن ۔ چھتری ۔ ویش ۔ شودر سب پڑھتے رہیں گے اور اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے موافق اس سی فائدہ اٹھائیں گے ۔ اسٹیشن سے ٹھیک بارہ بجے میں اپنے دو مصاحبوں یعنی رامچندر پرشاد اور تلجا رام کے ساتھ ایک ٹھیلہ یا ٹم ٹم میں جس میں ایک ضعیف گھوڑا جُتا ہوا تھا سوار ہو کر چلا۔ آفتاب کی گرمی "وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار" اور ٹم ٹم کے طرفہ ہچکولے اپنا اپنا اثر آپ دکھا رہی تھے ۔ یہ ٹم ٹم شمال کی جانب کی سڑک سی روانہ ہوئی جو بہ نسبت دوسرے راستوں کی بہت بہتر سمجھی جاتی تھی، مگر خدا کی پناہ اس کی عمدگی اس حد تک تھی کہ ہچکولوں کے باعث دو روز تک اٹھنا بیٹھنا محال ہو گیا ۔ میں نے بھی یہ خیال کر کے کہ رزم گاہ میں سوائے مصیبت اور تکلیف کے راحت کی تلاش خبط ہی جو کچھ تکلیف ہوئی اس کو قبول کیا۔

ہماری جہاں تک نظر پڑی درختانِ سبز پوش جوں قامت کشیدہ مودیب کسی کے جلوہ کے روبرو متحیر کھڑے تھے اور ان کی خاموشی اور سکوت کا عالم اس درجہ تھا کہ ایک پتّا بھی اپنی جگہہ جنبش نہیں کرتا تھا اور اس کا منظر ناظرین کو یہ سبق دے رہا تھا ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقِ دفتریست معرفتِ کردگار

کوئی اور شے ہماری نظر کو محسوس نہیں ہوتی تھی ایک سناٹے کا عالم ہو کا میدان زمین سرخی مائل تھی اور کیوں نہ ہو اب تک بہادر شہیدوں کا خون اس خاک میں اسی طرح پوشیدہ ہی جس طرح حنا میں سرخی - اِس سرزمین پر ایک قسم کی بیکسی او ریاس ٹپکی پڑتی ہی کہیں کہیں دائیں بائیں دیول اور مندر شکستہ حالت میں اپنی گذرے ہوئی جوبن کو یاد دلا رہی ہیں اور زبانِ حال سے کہتے ہیں ؎

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

اب وہ مقام آگیا جس کا نام "شنی کنڈ" ہی کہا جاتا ہی کہ بہادر راجپوت سورج بنسی اِس مقام پر جب آفتاب غروب ہو جاتا تھا تو اکھٹے ہو کر ایک دوسرے سے ملتے تھے گویا دن کے دشمن اور رات کے دوست ایک دوسرے کی ہمدردی میں رطب اللّساں ہوتے تھے اور اپنے اپنے جنگی کارناموں پر فخریہ چشمکیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ زخمی سپاہیوں کی دلجوئی اور دوا درمن میں مصروف ہو جاتا تھا

اور دشمن کے زخمی سپاہی کے ساتھ طرفین سی ایسی ہمدردی دکھائی جاتی تھی جیسے کوئی خاص اپنے عزیز و خویش کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہی۔ حقیقت میں "بنی آدم اعضائے یک دیگرند" کے فلسفہ سے وہ لوگ اچھی طرح واقف اور اُن کے دل توحید کی حقیقت سے آگاہ اور ان کے ارواح اس میدان وحدت کی سیر کیے ہوئے تھے اس لئے اُن کے نزدیک دوسرے کی زحمت گویا اپنی زحمت اور دوسرے کی راحت گویا اپنی راحت تھی بمصداق ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

الغرض ہم وہاں اُترے دو برہمن ہمارے نزدیک آئے اور اپنی پوربی زبان میں ہمیں دعائیں دے کر کہا کہ آپ اشنان کرلیں میں نے عذر کر کے اُن کی خدمت میں کچھ بھینٹ دیا اور اُن سے مختصر حالات جو اوپر بیان کئے گئے سُنے اور وہاں سی سیدھے پھر مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ اب وہاں پہونچے جس کا نام کرک تیرتھ ہی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کو ہندوؤں کی اصطلاح میں کنڈ کہتے ہیں۔ اس کے جنوبی کنارے پر ایک ٹیلہ ہی اس کو گھاٹ بھی کہتے ہیں اس پر مہادیو کا مندر ہی اس مندر سی اس کنڈ میں اترنے کے لئے زینے بنے ہوئے ہیں۔ اس چشمہ کا پانی گو زیادہ صاف نہیں لیکن معلوم ہوتا ہی کہ زائرین کے جسم کا میل دھونے سے اس کی صفائی میں بھی کدورت آگئی ہی جو بالکل عارضی ہی۔ جب ذرد عصیاں تہ نشین ہو کر خاک میں مل جائے گا اس کے

پانی کی حقیقی صفائی اپنا جلوہ دکھائے گی۔ یہ چشمہ کنول کی بیل سے سرسبز اور اُس کے پھولوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے پرورش کر رہا ہے۔ اس کے مقابل شمال رخ پر ایک اور مندر جو لچھمی نارائن کے مندر سے موسوم ہے بنا ہوا ہے اس میں زینے ہیں جن پر اسی چشمہ میں اُتر کر نہاتے ہیں۔ دونوں کنارے اس کے دو مندروں سے یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جنگ کے وقت جس طرح طرفین سے صف آرائی ہوئی تھی اور ہر ایک اپنے مقابل کے حریف کی ہستی کو فنا کرنے پر فوج خون کی پیاسی رہتی ویسے ہی یہ دونوں مندر ہر ایک فریق کو اُس خدائے وحدہٗ لاشریک کی شہادت دیتے جاتے تھے اور شجاعانِ میدان کو حدوث و قدم کے جلوے چشم بصیرت سے دیکھنے کا وعظ کیا کرتے تھے اور فنا بقا کے کرشمے پہچاننے کی فہمائش کیا کرتے تھے۔ مغرب کے کنارے سے مشرق کے کنارے کے مندر کو جانے کے لئے ایک پختہ پُل ہے اُس پر سے گزر کر اُس مندر میں پہونچتے ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس پُل کے دہنے بائیں ایک چشمہ دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے یہاں دوئی میں وحدت کا تماشا دیکھ لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر مورخوں نے مہابھارت کے قصّے کو جن پُر جوش الفاظ اور پُر اثر واقعات سے تصنیف کیا ہے اُس کے پڑھنے سے گزرے ہوئے بہادروں کی شجاعت اور بسالت کے کرشمے نظر آتے ہیں اس جنگ کا اصلی مقصود معارف کے فلسفہ کو سکھانا تھا جس کو ہادی برحق سری کرشن جی مہاراج نے ارجن سے بزبانِ حق گفتگو کرکے ہدایت کی ہے اور دوئی کے حجاب کو

اُٹھا کر وحدت کا نظارہ تبلا دیا اور تحقیق کے پردے میں حق کا تماشا دکھا دیا۔ رہبرانِ حقیقت کو کثرت کے عالم میں وحدت الوجود کو ثابت کر دیا اور اوّل و آخر ظاہر و باطن شش جہت میں اُس ایک معبود حقیقی کے جلوے کو چمکا کر دکھا دیا۔

چھووں دِشا میں آپ سمایا　　جت تت سوں میرے من بھایا

اندر باہر ڈھونڈت پھریا　　ڈھونڈھ تھکے پچ آپا پایا

ہر ولی سی دنیوی لذات اور محبت کے جو دلوں پر دھاوا کئے ہوئے تھے ان کو یہ کہکر فہمائش کی۔

ہیچ میدانی چہ چیزے ھیستی و کیستی　　خویش را در باب دائم ہستی و نیستی

آنکہ می گوید کلیم ست آنکہ می شنود سمیع　　آنکہ می بیند بصیر ست اے بگو تو کیستی

الغرض اس جنگ میں حکمتِ الٰہی یہ تھی کہ گمرہانِ طریقت ہادی برحق سری کرشن جی سے ہدایت پاکر راستے پر آئیں اور اپنی اور جنگ کی حقیقت کو پہچان کر راضی برضاءِ الٰہی رہنے کا سبق حاصل کریں اس لئے کہ۔

گر دعویٔ ہستی ست بہتان ست ایں　　در دعویٔ نیستی ست کفران ست ایں

اے حضرتِ انسان تحیرّ بنیاد　　خود را نہ شناختی چہ عرفان ست ایں

سبحان اللہ تعالیٰ شانہٗ، جب ہم وہاں پہونچے چند برہمن جمع ہوئے ایک ان میں سے وکیل تھا ہمارے خاندان کا جس کو "پروہت" کہتے ہیں اُس نے ایک قدیم پُرانی بیاض پیش کی اور ایک پرچہ کاغذ کا اُس کے ساتھ جو تقریباً ساٹھ برس کا

ہو گا۔ اُس کاغذ میں میرے جدّ امجد مہاراجہ بالا پرشاد المخاطب بہ راجہ دہراج نے اپنے قلم سے اس برہمن مسمّیٰ رام چندر آتمارام ویدی پنڈا کورکشتر کو سند لکھدی ہے کہ مشارٌ الیہ اِس خاندان چند و لعل کی جانب سے وکیل مقرر کیا گیا۔ میں نے اس دستخط کو پہچان کر آنکھوں سے لگایا تعظیم کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ میرے خاندان میں سوائے میرے جد امجد راجہ دہراج کے اس وقت تک کسی نے کورکشتر کی جاترا نہیں کی۔ اس وقت بخت اور اتفاق نے مجھے بھی درشن کرنے کا موقع دیا میں نے بھی اُس وکیل کو اپنا وکیل تسلیم کیا۔

یہ برہمن مجھے اشنان کرنے کے لئے مصر ہوا چونکہ وقت بارہ بجے کا تھا میں اپنے معمولی حمّام یا اشنان سے فارغ ہو کر کھانا بھی کھا چکا تھا اصل مقصود میرا ان مقامات کو دیکھکر تاریخی حالات کے ساتھ مقابلہ کرکے اس کی موجودہ شان کو اُس کی خیالی شان سے مطابقت کرکے عبرت کا سبق حاصل کرنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں جہاں بڑے اوتاروں نے اپنے خیر مقدم سے سرزمین کو سعادت بخشی ہے وہ سرزمین بیشک چومنے اور عظمت کے لایق ہے اور میں ادب کرتا ہوں اور عظمت اور عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن تیرتھ اور جاترا جو باعثِ نجات ابدی سمجھے جاتے ہیں میرا عقیدہ اس جگہ سوائے سکوت اور ادب کے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتا مگر ہاں سچّی عقیدت کا یہ فیصلہ ضرور ہے کہ

پار کہیں تو پار ہے اور وار کہیں تو وار   پکڑ کنارہ بیٹھ رہ ہیں وار ہیں پار

لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ بدون معرفت حاصل ہونے کے نجات اور سرور دائمی اور اطمینانِ خاطر ہرگز ہرگز نہیں حاصل ہوسکتا۔

الغرض میں نے وہاں کے برہمنوں کی خاطر سے گرمی کے وقت ٹھنڈے پانی میں ایسے مقدس مقام پر جس کے دامن کے ساتھ کروڑہا نفوس کے عقائد وابستہ ہیں مناسب سمجھکر اشنان کیا اُس وقت مجھے یہ رباعی یاد آئی ؎

آں آب حیاتے کہ بشر میجویند | وز ہر طرفش نشانِ راہش پوئند
پیوستہ بدریا بمثال ماہی | گر در نگرند انے وے دراوئید

فی زماننا رسوم میں افراط تفریط ہونے سے اصلی حسن کی خوبی جاتی رہتی ہے اس لئے میں افراط تفریط کے ساتھ کسی رسم کو بھی ادا کرنے میں احتیاط کرتا ہوں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ بہت سے رسوم یہ کہکر ترک کر دیئے ؎

ہم مُوَحِّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹگئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اصلی مقصود جاترا کا یہ بھی ایک ہے کہ اس قدر دور دراز کا سفر اختیار کرکے ایسے مقامات پر آنا نہ صرف اس غرض سے ہے کہ اپنی ذات کو نفع پھونچے اس لئے کہ اپنی ذات کو نفع انسان ایسے ابواب میں ہر طرح پھونچا سکتا ہے مگر بہت بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہم غربا اور مساکین اور مستحقین کی خدمات کریں اور خداوند عالم کی حکمت بھی یہی ہے کہ اپنے بندوں کی خدمت کسی حیلہ سے بھی متمول نامدار رشانداز لوگوں کے

ذریعے سے کراتا ہے یہ خود ایک ایسی سعادتِ عظمیٰ ہے کہ اس کو ترک کرنا یا اس کو فضول سمجھنا دانشمندی سے دور ہے میں نے بہت خوشی سے ان وکلا کی خاطرداری کی اور یہ کہکر غوطہ لگایا ؎

مامنکر راہِ مسجد و کعبہ نہ ایم
راہیکہ بمقصود رساند دگر ست

اخّاہ! یہ وہ چشمہ ہے جس میں جنگ کے زمانے میں بہادروں کے خون کی ندیاں بہکر اس میں اگر نہ ملی ہونگی تو کیا خون کے چھینٹے بھی نہ ملے ہونگے۔ کیا یہ وہ چشمہ نہیں ہے کہ جس کے کنارے بہادر شہید کٹکر پڑے ہیں اور آخری وقت الوداع جاں کندنی کی گرمی العطش العطش کہنے کو ان کی اصلی بہادری کی غیرت تقاضا نہ کرتی ہوگی؟ تشنہ لبی چاہتی ہوگی کہ کوئی خدا کا لال ایسا مل جائے کہ ایک گھونٹ پانی اس چشمہ کا منھ میں ڈالدے مگر اُس وقت کوئی پانی پلانے والا نہیں ملتا۔ پانی کے پاؤں تو ہیں نہیں کہ خود جاکر ان کی تشنہ لبی کو سیراب کردے اس لئے اس کی بھی یہ خواہش ہوگی کہ کوئی اس کو لے جاکر اُس بہادر کے سوکھے حلق میں ڈال دے جس کا آب خنجر کی حرارت کے باعث گلا خشک ہورہا ہے مگر اس وقت سوائے حسرت کے اس کے راز و نیاز کو دیکھنے اور جاننے والا کون ؎

واہ رے بہادرو! کیسے تم سپوت ہو اور کیسی تمھاری بہادری ہے کہ خشک گلے رکھکر اور حسرت بھری نظروں سے اس چشمہ کو دیکھکر بھی تم نے اپنی ہوس پوری

ہونے کے لئے دشمن کا احسان تو کجا دوست کا بھی احسان نہ اُٹھایا اور چشم زدن میں اس چشمہ کے کنارے اپنی پیاری جان گنوا کر امرت دھارا کی تمنا میں پیاسے اس دنیا سے سدھارے بیشک سدؔ باعی

نے ز امید و فارغ از یاس و ہراس   این ست عبادتِ فقیراں بشناس

از خود رستند و با حقیقت پیوستند   نے خطرہ و نے تفرقہ و نے وسواس

افوہ! کلیجا منھ کو آتا ہے۔ آہ یہ وہ چشمہ ہے کہ جس میں ہواؤں کی آنکھ کے آنسو دریا بن کر نہ ملے ہوں گے تو کیا ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح اس میں اُن آنسوؤں کی بوندیں نہ برسی ہونگی جس میں تمام مخلوق نہانے کو سعادت اور نجات ابدی خیال کرتی ہے

آہ کیا یہ وہ چشمہ نہیں ہے کہ شریف ستی کی جلی ہوئی راکھ اس میں نہ ملی ہوگی کیا یہ وہ چشمہ نہیں ہے جس کے کنارے ننھے ننھے بچے دودھ سے بلبلا کر اپنی شیریں جانیں گنوانے پر مجبور ہوئے مگر ان کی پتی ورتا ماؤں نے اپنے شوہر کی جان کے مقابل اپنی اولاد کی جانوں کی پروا تک نہ کی ننھی ننھی جانیں ماؤں کے سامنے تلف ہوگئیں ماؤں نے اُن کا بلبلانا سُنا اور اپنے دلوں پر صبر کا پتھر رکھ لیا مگر ان کی دھن جو جو اپنے اپنے شوہروں کی زیست و مرگ کے ساتھ شخص و عکس کی طرح ایک روح دو قالب بنی ہوئی تھیں اُنھیں ذرا بھی پروا نہیں ہوئی (ریت) اپنے پتی کے سچے عشق کے مقابل اولاد کی محبت کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ ہائے آج کے روز اس چشمہ میں ہم لوگ فخر سے نہاتے ہیں مگر اُن لوگوں کے نام پر چار آنسو نہیں بہاتے اور ان کو یاد کر کے دل پر ہاتھ نہیں رکھتے

آہ کیا کلجگ کے زمانہ والو! تمھارے دل پتھر کے ہوگئے ہیں۔ تمھارے کلیجے لوہا بنگئے ہیں کیا تم میں درد نہیں۔ اُلفت نہیں کیسے تم سنگدل ہو کہ تمھارا دل واقعات سُن کر بھی نرم نہیں ہوتا۔ مصائب پڑھ کر بھی دل نہیں پسیجتا۔ خیر مرگ انبوہ جشنے دارد اس میں شک نہیں کہ میں نے اس میں برہمنوں کی خاطر سے اشنان کیا مگر جو جذبات میرے دل میں پیدا ہوئے جن کا اظہار قلم سے ہوا ہے اُن کی یاد آنے کے ساتھ ہی میری جو کیفیت متغیر ہوئی اُس کو بیان کرنا مبالغہ سے خالی نہوگا۔

الغرض اس ذریعے سے رزاقِ حقیقی کو جس جس کی خدمت مجھ سے کرانی تھی الحمدللہ اُن خدمات کی ادائی سے فارغ ہو کر اپنے کیمپ کو واپس ہوا اور اس پر ایک نظم لکھی جو درج ذیل ہے۔

غزل

آیا جو کرک شیتر میں دیوانہ کسی کا
نظروں میں پھرا جلوۂ حقّانہ کسی کا

کہتے ہیں اسے رزمگہ کورو و پانڈو
کہتا ہے کوئی یہ کہ ہے بت خانہ کسی کا

تاریخ کوئی اس کی سُناتا ہے یہ کہکر
مشہور جہاں میں ہے یہ افسانہ کسی کا

اشنان کا جو کنڈ ہے دراصل وہ کیا ہے
پُر ہے مے اُلفت سے یہ پیمانہ کسی کا

بت خانہ جو مشہور مہادیو کا یاں ہے
دراصل یہ بُت خانہ ہے کاشانہ کسی کا

کس طرح سے اشنان کی سوجھی نہیں معلوم
شیدا نہ ہوا تھا دلِ دیوانہ کسی کا

ہاں مظہرِ حق یہ بھی تو ہے شاد نہیں شک
کیا خوف اگر تو ہوا دیوانہ کسی کا

لیکن ہے حقیقت میں پری خانہ کسی کا	بت خانہ میں جزبت کے ہے کیا اور نظارہ

شاہانہ جو دربار کسی کا ہو تو اے شاد
ہے یہاں بھی مگر ٹھاٹھ فقیرانہ کسی کا

میں تمام دن یہاں اسٹیشن پر رہا اور شب کو ۹ بجے بذریعہ اسپیشل روانہ ہو کر شب کو ½-۱۱ بجے پانی پت کے اسٹیشن پر پہونچا۔ فیاض علی خاں اسٹیشن ماسٹر کو رک نستر کا میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مولوی عبدالعزیز صاحب پیرزادے کو بذریعہ خط کے میرے آنے اور گاڑیوں کے انتظام کے لئے اطلاع دیدی تھی بلکہ حکم چند نام ایک شخص کو ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت رامچندر پرشاد اور وٹھل راؤ انگریزی ماسٹر کو حکم چند کے ساتھ مولوی عبدالعزیز صاحب کے پاس گاڑیوں کے انتظام کے لئے بھیجا۔ ۲ بجے یہ لوگ واپس آگئے

۲۷۔ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء (مطابق) ۲۱۔ شہریور سنہ ۱۳۲۲ف

۷ بجے صبح کے ۸ گاڑیاں جن میں ۲ رتھ اور ۶ منجھولیاں تھیں اسٹیشن پر آگئیں اور میں ۸ بجے مع زنانہ اسٹاف کے حضرت بخشی ہند شاہ شرف الدین بو علی شاہ قلندر فوق الوصل الحیدری قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

بارگاہ میں حاضر ہونے کے بعد مجھ پر ایک ایسی بیخودانہ حالت طاری ہوئی جو اس سے کہیں زیادہ تھی کہ میں الفاظ میں اس کو ظاہر کرسکوں۔ جلالت کے پردے اٹھے ہوئے تھے۔ وحدت کے جلوے کثرت کے پہلوؤں کو دبائے ہوئے تھے عزت و جبروت کے آفتاب کی شعاعیں ہر در و دیوار پر اپنی روشنی ڈال رہی

تھیں اور زبان حال سے کہہ رہی تھیں

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ ست

حضرت کے سرہانے حضرت کے معشوق کی قبر بنی ہے زیارت کی۔ عاشق و معشوق کے راز و نیاز کے اثر نے دل پر عجیب طرح کی کیفیت پیدا کر دی۔ سبحان اللہ سچ ہے کہ "اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا یَمُوْتُوْنَ"

درگاہ کے بیرونی دالان میں چار ستون سنگ کسوٹی کے نصب ہیں جو ہندوستان بھر میں ایک بے نظیر اور بیش قیمت سمجھے جاتے ہیں۔ مردانہ کی زیارت کے بعد محلات کی زیارت کا انتظام کر دیا گیا ہیں جس وقت روضہ میں زنانہ کو لے کر کر داخل ہوا ہوں بے ساختہ زبان سے یہ شعر نکلا ؎

پردہ اٹھا کے اب تو دکھا جلوۂ جمال | مشتاقِ دید ہم ترے آئے ہیں دور سے

اس کے ساتھ ہی یہ مطلع بھی ذہن میں آیا ؎

لبریز دل ہے ساقیِ کوثر کے نور سے | ساغر بھرا ہوا ہے شراب طہور سے

چونکہ طبیعت کو ایک جوش تھا دوسرا مطلع بھی بیساختہ زبان پر جاری ہو گیا

جھپکی مری پلک نہ کسی رخ کے نور سے | موسیٰ ہی تھے کہ ہو گئے غش برقِ طور سے

زیارت سے مشرف ہونے کے بعد مع زنانہ و مردانہ اسٹاف کے حضرت مخدوم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی درگاہ میں گیا۔ اس درگاہ کے بیرونی دروازے پر مولوی الطاف حسین صاحب حالی سے ملاقات ہوئی اور دیر تک

اُن سے باتیں کرنے کے بعد رخصت ہوا۔ مولوی صاحب کی تعریف کس قلم سے لکھوں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس وجود کو ابھی باقی رکھے۔ مولوی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مجھ سے روانگی کے قبل آکر ملیں گے۔ زنانہ و مردانہ اسٹاف کے ساتھ زیارت سے مشرف ہوا۔ حضرت شاہ ولایت صاحب کی درگاہ میں گیا اور یہاں سے حضرت غوث علی شاہ قلندر کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مولانا غوث علی شاہ سے اگرچہ میری ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی توحید پرستی اور صلح کل مشرب کے واقعات نے (جس قدر پڑھے اور سُنے گئے) مجھے معتقد کر دیا تھا۔ نا دیدہ میں آپ کا سچّا بے ریا معتقد ہوں اور دیرینہ آرزو کے پورا ہونے کی مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور درحقیقت زیارت سے اُن کے اللہ والے ہونے کا ثبوت ملا۔ وہاں مولوی گل حسن صاحب متولی و خلیفہ حضرت غوث علی شاہ قلندر سے دیر تک ملاقات رہی اور وہاں سے سیدھا اسٹیشن پر آیا۔ حضرت بو علی شاہ قلندر کی نیاز سہ منی کا جو اہتمام کرایا گیا تھا چونکہ میں کسی قدر خستہ تھا نہ جا سکا غبار صاحب کو بھیج کر نیاز سہ منی کی فاتحہ دلوا دی گئی۔

۳ بجے شام کے ایک ڈپوٹیشن آیا جس میں تحصیلدار تحصیل پانی پت و دیگر معززین تھے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کے ساتھ دیوی کے درشن کو جاؤں لیکن میں نے اپنی خستگی کا عذر کیا اور ۵ مہر انگریزی اُن کی نذر کی۔

شب کا وقت عموماً خیالات کا جولانگاہ ہوا کرتا ہے صبح کے اشعار کو یاد کرکے

ایک غزل بہت تھوڑی دیر میں تمام کردی۔ وہ تینوں شعر مکرر لکھتا ہوں ؎

جھپکی مری پلک نہ کسی رُخ کے نور سے
موسیٰؑ ہی تھے کہ ہوگئے غش برقِ طور سے

لبریز دل ہے ساقیِ کوثر کے نور سے
ساغر بھرا ہوا ہے شرابِ طہور سے

پردہ اُٹھا کے اب تو دکھا جلوۂ جمال
مشتاقِ دید ہم ترے آئے ہیں دُور سے

دیکھ آئے آج جلوۂ رخسارِ یار ہم
روشن ہے آنکھ روشنیِ شمعِ طور سے

کیا سمجھے اور حضرتِ موسیٰؑ سمجھ گئے
غمزہ ہوا جو چشم تجلّاے طور سے

مستی میں بھی ہے دل کی مرے پاکدامنی
دامن بھی تر ہوا تو شرابِ طہور سے

ہے دل سے دُور پر ترا جلوہ ہے آنکھ میں
دیکھا کئے ہیں ہم تجھے نزدیک و دُور سے

وہ ہو نہو مرا شررِ سوزِ قلب ہو
سنتا ہوں کوئی شعلہ اُٹھا کوہِ طور سے

کیا دیکھا کس کو دیکھا کہ یہ حال ہوگیا
لوگ آئے مجکو دیکھنے نزدیک و دُور سے

اے دل نہ کڑھ نتیجۂ بعدِ وطن ہے عیش
یوسفؑ عزیزِ مصر ہوئے آکے دُور سے

کیا احتیاجِ شمع ہے جس گھر میں تم رہو
روشن ہے قصرِ خلد تجلّیِ طور سے

دعوای دید پر بھی نہ دیکھا گیا جمال
موسیٰؑ بہت بعید ہے یہ اک غیور سے

اُمید وصل سے بھی نکلتا نہیں ہے اب
غم ایسا مل گیا ہے دلِ ناصبور سے

کیا دیکھیں کس کو دیکھیں کہ تاریک ہے جہاں
موسیٰؑ کی آنکھ میں ہے جکا چوند نور سے

جل جائے کوہ اور نہ موسیٰؑ پہ آنچ آئے
تاثیر بدلی نار کی اے شادؔ نور سے

چونکہ میں اسٹیشن پر ڈبوں میں تھا جنگل کا واسطہ، شمع پر پروانوں کا ہجوم اندازہ سے زائد تھا۔ میں نے اپنے مصاحب رامچندر پرشاد کو جو اس وقت میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے مخاطب ہو کر فی البدیہہ ایک شعر سنایا۔

عشق میں جی سے گزرنے ہی سے ہوتا ہی فروغ
نام روشن ہوا جل بجھنے سے پروانے کا

کسی قدر وقفہ سے دوسرا شعر بھی موزوں ہو گیا۔

چار سو دیکھ رہی ہی یہ اٹھائے گردن
شوقِ نظارہ ہی کیا شمع کو پروانے کا

طبیعت کو حاضر دیکھ کر یہ غزل بھی پوری کی۔ مطلع یہ ہے

پنجۂ غیر سے جب کام لیا شانے کا
زلف سے اس کی لڑا ادر دھرے شانے کا

بت پرستی میں بھی ترکِ ادب دیں نہ گیا
سنگ ہم کعبہ میں رکھ آئے صنم خانے کا

روتے ہی روتے کٹی عمرِ طبیعی اس کی
کس قدر شمع نے غم کھایا ہی پروانے کا

حشر ہو جائے تو فرصت میں سناؤں اس کو
ایک دفتر ہی مری زیست کے افسانے کا

سالکِ راہِ طریقت تمھیں سمجھیں اے شیخ
راستہ چل کے بتا دو جو صنم خانے کا

ہیں ازل سے نگہِ مست کے کیفی ہم رند
نام لب پر بھی نہ لائے کبھی پیمانے کا

ہر کوئی اپنے طریقے پہ چلا جاتا ہی
کوئی کعبہ کا ہی رہرو کوئی بت خانے کا

کفر و اسلام کے جھگڑوں سے سبکدوشی ہی
ہم پیالہ پیے بیٹھے ہیں جو میخانے کا

ہم موحد ہیں کیا کرتے ہیں اکثر اے شاد
کبھی کعبہ کا طواف اور کبھی بت خانے کا

اور دو غزلیں جو مختلف قافیہ ردیف میں موزوں ہوئیں ان کو بھی ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں

خالی نہ گئی زحمتِ فریاد اثر سے — تھامے وہ کلیجے کو نکل آئے ہیں گھر سے
آنکھوں سے ترے دل میں میں آ سکتا ہوں لیکن — مجبور ہوں نیرنگیِ انداز نظر سے
یارانِ عدم ہم سے سنو حالتِ دنیا — اس خواب کو دیکھ آئے ہیں ہم اپنی نظر سے

سب اپنے مزاروں سے قیامت میں اُٹھینگے
شاد اُٹھے گا شاہنشہِ اجمیر کے در سے

محشر میں خراماں جو وہ بیداد گر آیا — فتنہ نے کہا اٹھکے یہ فتنہ کدھر آیا
بے ساختہ دل تھامے ہوئے وہ ادھر آیا — کیا جذبِ محبت میں مرے کچھ اثر آیا
کیا کیا نہ ہوا وصفِ شکیبائیِ اغیار — میں شب کو تڑپتا جو درِ یار پر آیا
درد اُٹھا کس آداب سے تعظیم کی خاطر — جب دل میں خیالِ بتِ بیداد گر آیا
اے داورِ محشر بھلائی کہ برائی — جو کچھ مجھے کرنا تھا وہ دنیا میں کر آیا
آج اس پہ تو کل اُس پہ مرے اُس سے لڑی آنکھ — جینے کا طریقہ نہ ہمیں عمر بھر آیا
اک دن بھی نہ ٹھکرائی گئی تربتِ عاشق — فتنہ بھی اٹھانا نہ تجھے فتنہ گر آیا
کیا جانئے کیا ملکِ عدم کی ہے فراغت — ہستی میں جب آیا ہے کوئی نوحہ گر آیا
کچھ اپنی نہیں مجکو خبر کون ہوں کیا ہوں — ہستی میں عدم سے میں بہت بیخبر آیا

اے اہلِ عدم شکر ہی خوش گزری کہ ناخوش ... طے مرحلۂ عمر بہر حال کر آیا

زائر ہوا میں تو علیؑ شاہ کا اے شادؔ
ارمان بر آیا مرا ارمان بر آیا

۲۸ - جولائی سنہ ۱۹۱۳ء
(مطابق) ۲۲ - شہریور سنہ ۱۳۲۲ ف

آج صبح کو مولوی الطاف حسین صاحب حالی آئے ان کا دم نہایت غنیمت ہے گو پیری نے اپنا عمل دخل کر لیا ہے۔ مگر دل جوان اور عقل آزمودہ کار ہے۔ ان کی ہر بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں ایسی اترتی ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ خدا زندہ رکھے لطفِ صحبت سے میں نہایت محظوظ اور مستفید ہوا۔ بہت دیر تک باتیں رہیں۔ ۱۱ بجے ہمارے ڈبے روانہ ہونیوالی ٹرین میں لگائے گئے اور ہم وہاں سے روانہ ہو کر ڈیڑھ بجے دہلی پہونچے۔ شب کو میں نے یہیں مقام کیا۔ اور ضروری تاروں اور خطوط کا جواب دیا۔

۲۹ - جولائی سنہ ۱۹۱۳ء
(مطابق) ۲۳ - شہریور سنہ ۱۳۲۲ ف

لہ ۱۰ بجے ہماری گاڑی چھوٹی اور ۳ بجے متھرا اور متھرا سے روانہ ہو کر ۷ بجے آگرہ فورٹ اور آگرہ فورٹ سے ۱۰ بجے شب کے روانہ ہو کر صبح کے ۶ بجے کان پور پہونچی چونکہ میں اپنے فرزند برخوردار عثمان پرشاد اطال اللہ عمرہٗ کی نادرستی مزاج کی وجہ سے سرعت کے ساتھ سفر کر رہا تھا لہذا ان مقامات پر معمولی وقفوں کے سوا زیادہ قیام نہیں کیا۔

۳۰ - جولائی سنہ ۱۹۱۳ء
(مطابق) ۲۴ - شہریور سنہ ۱۳۲۲ ف

آج صبح کو چھوٹی حاضری کے کچھ دیر بعد درد شکم میں مبتلا ہوا سید برہان صاحب اسسٹنٹ ڈاکٹر محمد حسین نے جو میرے اسٹاف

میں تھے دوا حاضر کی ۱۲ بجے افاقہ ہوا لیکن تسکین نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے بے ریا دوست اکبر حسین اکبر پنشنر جج کو بذریعہ تار اپنی آمد کی اطلاع دی اور اپنے مصاحب رامچندر پرشاد کو کرایہ کی موٹر لانے کے لئے حکم دیا مگر نہ ملی۔ شب کے ایک بجے کان پور سے روانہ ہو کر ۵ بجے صبح کے فتحپور ہسوہ ہماری گاڑی پہونچی۔ اپنے ڈبے علیحدہ کرنے کا حکم دیا۔ اس لئے کہ مجھے حضرت نجم الدین میاں شاہ صاحب کی زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔

۳۱-جولائی سنہ ۱۹۱۳ء
۲۵-شہریور سنہ ۱۳۲۲ف مطابق

چھوٹی حاضری سے فراغت پاکر مع غبار صاحب اور رامچندر پرشاد اور خدمتیوں کے حضرت نجم الدین میاں کی ملاقات کو گیا۔ میں نے تکیہ شریف کے قریب پہونچکر گاڑی سے اُتر کر دیکھا کہ ایک چھوٹے سے ٹیلہ پر مشرق رُخ پر ایک مسجد چھوٹی سی بنی ہوئی ہے۔ شاہ صاحب مسجد کے باہر کے ڈھالیہ کے قریب چہل قدمی کر رہے ہیں اور چشم براہ ہیں۔ گویا کسی کے انتظار میں ہیں۔ ہم کو دیکھکر دونوں ہاتھوں سے ہمارے مقام پر ہم کو کھڑے رہنے کا اشارہ کیا تھوڑی دیر کے بعد ایک مرید اُن کا آیا اور کہا کہ تم میں سے ایک آدمی حضرت کی خدمت میں باریاب ہو۔ چنانچہ میں آگے بڑھا اور حضرت کی شرفِ قدمبوسی سے مشرف ہوا حضرت کی قوت جاذبہ سلوک کی حالت پر غالب تھی جس نے چہرہ کے رعب کو چمکا دیا تھا۔ آنکھ کو یارا نہ تھا کہ اُن کی طرف دیکھ سکے۔ میں جس وقت قدمبوس ہوا ہوں حضرت نے پہلے مجھ سے نام دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ کیا اپنے خادم شاد کو فراموش کر گئے۔ تب تو مجھے اپنے سینہ سے لگا کر زور سے دبایا۔ مزاج پوچھا اور ایک تخت پر جو صحن میں

بچھوایا گیا تھا۔ بیٹھ گئے۔ مجھے بھی بیٹھنے اشارہ کیا۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ مگر حضرت کی توجہ باطنی کا اثر میرے قلب کو متاثر کر چکا تھا۔ مقناطیسی کشش نے مجھے ہمہ تن اُن کے دیدِ درشن کی طرف محو کر دیا۔ مدتوں کی خون دل سے پالی ہوئی آرزو تقاضا کرتی تھی کہ منتظر آنکھیں دیدار سے فیضیاب ہوں مگر جذباتی رعب کا حجاب حائل تھا۔ میں بیخود تھا اور اپنے جذبات کو روک رہا تھا۔ آخر اس خاموشی کے حجاب کو سلسلۂ کلام سے خود ہی حضرت نے اٹھایا اور فرمایا کہ سفر میں بہت تکلیف ہوئی۔ اچھی طرح بیٹھو۔ کب جاؤ گے؟ ہر سوال کا جواب عرض کیا گیا۔ فرمایا نامناسب نہوگا اگر شام کو بھی مجھ سے ملو۔ بہت خوب کہکر برخوردار عثمان پرشاد کے لئے دعائے صحت کی خواہش کی اس کو قبول فرمایا مگر وہی آخر ہوا جو مقتضائے مشیت تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے رخصت ہوا۔ ان کے مریدوں سے ایک شخص نے تعمیر مسجد کے متعلق ایک درخواست پیش کی برخوردار عثمان پرشاد کی طرف سے دو سو روپیہ اُن کو دیکر وہاں سے ۱۰ ½ بجے اسٹیشن کو واپس ہوا۔ دوپہر کا وقت۔ اسٹیشن پر قیام۔ میں نے نظم کی طرف اپنی طبیعت کو رجوع کیا۔

طبیعت چاہتی ہے آج جائیں بزم رنداں میں	وہاں سے ساتھ لیکر جائیں ساقی کو گلستاں میں
نہیں ہے کچھ نئی یہ بات اے دست جنوں لیکن	چلی آتی ہے آپس کی رقابت جیب و داماں میں
فقط اک شغل ہے دست جنوں کے واسطے ورنہ	رکھا ہی کیا ہے ہاں کچھ تار ہیں اس جیب و داماں میں
کسی کے کیا چھڑائے سے چھٹے یہ کش مکش توبہ	شگوفہ چھوڑ رکھا ہے جنوں دست و گریباں میں
کلیجے میں کھٹک جاتا ہے ظالم پھانس کے مانند	ابھی تک یہ اثر باقی ہے اس کی نوک مژگاں میں

نہیں ہی جن کو کچھ صبحِ وطن کا لطف ہی حاصل
مزہ آئیگا کیوں کر اُن کو پھر شامِ غریباں میں

یہ اندیشہ ہی بل پڑ جائے قیمت میں نہ کچھ میری
پھنسا ہی طائرِ دل جاکے اِس کی زلفِ پیچاں میں

میں کفر و دیں کے جھگڑوں سے ہمیشہ دور رہتا ہوں
ہی اندیشہ نہ پھنس جاؤں کہیں میں جاکے زنداں میں

ترے در پر کھڑا ہی شاد پھیلائے ہوئے دامن
الٰہی گوہرِ اُمید بھر دے اِس کے داماں میں

دیگر

ہندو ہیں بہت اور مسلمان بہت ہیں
لیکن کہوں کیوں کر کہ خوش ایمان بہت ہیں

کس طرح سے انسان کے ارمان ہوں پورے
ہی عمر بہت تھوڑی سی ارمان بہت ہیں

الفاظ تراشے ہوئے ہیں کافر و مومن
سچ پوچھو تو ہر دین کے انسان بہت ہیں

اترا گئے ہم عاشقِ جانباز جو کہلائے
معشوق وہ کہلا کے پشیمان بہت ہیں

کیا مجھ سا وفادار بھلا کوئی ملے گا
ہر چند کہ عاشق ترے انجان بہت ہیں

اللہ بچائے کہ ہیں دل میں الم و یاس
اِس گھر کے اُجڑنے کے بھی سامان بہت ہیں

ناسازیِ تقدیر کی تدبیر ہو کس سے
وہ کام ہیں دشوار جو آسان بہت ہیں

کیا جانئے ابھی وہ کہ جفا کیا ہے وفا کیا
کمسن ہیں بہت سادہ ہیں نادان بہت ہیں

ہر بات پہ اغماض کئے جاتے ہیں وہ کیوں
دیکھو تو اُنھیں آج وہ انجان بہت ہیں

اللہ سلامت رکھے اِس دستِ جنوں کو
کرنے کے لئے چاک گریباں بہت ہیں

کیا شکر ادا ہو سکے محبوبِ دکن کا
شاد آصفِ ذیجاہ کے احسان بہت ہیں

دیگر

طبیعت دم محبت میں وفاداری کا بھرتی ہے | سراسر بیوقوفی ہے غلط یہ کام کرتی ہے
وہی ہیں چار عنصر اک کرشمہ اس کی صنعت کا | یہی مٹی بگڑتی ہے یہی مٹی سنورتی ہے
اگرچہ خالق و مخلوق کا سائنس منکر ہے | مگر بے قوتِ اعلیٰ کوئی پستی ابھرتی ہے
نہ ہم میں بیوفائی ہے نہ ہم میں خودنمائی ہے | ہماری بیخودی ناحق ہمیں بدنام کرتی ہے

زمانہ کی طبیعت دیکھ اے شادؔ ہنرپرور
تنفر انڈین بیوی سے لیکن مس پہ مرتی ہے

دیگر

نہیں ہے جام تو چلو خدا کی راہ ملے | کبھی تو ہم سے بھی پیرِ مغاں نگاہ ملے
ہماری کون سنے گا ملے گی داد کسے | تمہاری طرح سے کوئی اگر گواہ ملے
گیا جو میں طرفِ میکدہ تو رستے میں | کہیں تو کعبہ کہیں دیر و خانقاہ ملے
ترا ہی دونوں جہاں میں ہے آسرا ہم کو | تری ہوئے تو ہمیں پھر کہاں پناہ ملے
خدا کی دی ہوئی نعمت کا شکر ہے تو یہ ہے | کہ منعم اپنے فقیروں سے گاہ گاہ ملے
طلب ہے خضرِ طریقت کی اس لیے ہردم | خدا کے گھر کی ہمیں کوئی ایک راہ ملے
نہیں ملاتے اگر دل تو خیر جانے دو | خدا کے واسطے کافی ہے گر نگاہ ملے
میں کب سے منتظرِ راہ اُن کا بیٹھا ہوں | بناؤں آنکھ کا سرمہ جو گردِ راہ ملے

مجھے تو کوچۂ محبوب سے ہے کام اے شادؔ
غرض نہیں ہے مجھے دیر و خانقاہ ملے

رباعی

شاداحمدِ مرسل کی ثنا کرتا ہے ‌ حق بندگیِ حق کا ادا کرتا ہے
ممدوحِ خدا کی مدح ماشاءاللہ ‌ بندہ ہے مگر کارِ خدا کرتا ہے

½ ۵ بجے شام کے پھر میں عیار صاحب کو ساتھ لے کر حضرت نجم الدین میاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور شرفِ ملاقات سے مشرف ہو کر ½ ۶ بجے فتحپور کے اندر گیا بازار قطع کرنے کے بعد حضرت سید شاہ قبلہ کی درگاہ میں فاتحہ پڑھ کر کیمپ کو واپس ہوا۔

شب کے آٹھ بجے ایک ڈیپوٹیشن ہندو پاٹ شالہ کا آیا جس میں نانک چند کھتری و رامچندر وکیل و کامتا پرشاد کایستھ وغیرہ تھے اور ایک انگریزی اڈریس پیش کیا جس کے آخر میں خواہش کی گئی تھی کہ ہندو پاٹ شالہ میں میں بھی شریک ہو کر مالی مدد کروں۔ میں نے وہ عرضی لے کر رامچندر پرشاد کو دی اور الہ آباد میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ شب کے ½ ۱۲ بجے میرے ڈبے گوڈس ٹرین میں لگا دیئے گئے اور میں قبل طلوعِ آفتاب الہ آباد کے اسٹیشن پر پہونچ گیا۔

یکم اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۲۶ شہریور ۱۳۲۲ف اپنے ڈبے علیحدہ کرا کر ایک طرف قیام کیا۔ لاہور سے الہ آباد تک پنکھوں اور روشنی کی مجھے ناقابل برداشت تکلیف برداشت کرنی پڑی کیوں کہ میرے سیلون اور فرسٹ کلاس و سکنڈ کلاس وغیرہ میں بجلی کی قوت بہت کم تھی جس کا الہ آباد میں انتظام کیا گیا۔ آج برخوردار عثمان پرشاہ کا ٹمپریچر ایک سو دو درجہ تھا جس کی وجہ سے میں نہایت پریشان تھا۔ کوٹھی کا انتظام کیا گیا مگر کوئی کوٹھی دلخواہ

نہ ملی میں تمام دن کہیں نہیں گیا۔ شام کو حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب آئے اُن سے مل کر میں نہایت خوش ہُوا دیر تک لطفِ صحبت حاصل رہا۔ خواجہ صاحب بچّی کی حالت دیکھکر واپس گئے اور ایک ڈاکٹر زاہد حسین صاحب کو لاکر بچّے کو دکھایا ڈاکٹر صاحب نے دیکھکر کہا کہ ٹمپریچر کی زیادتی حرج ہے دانت نکلنے کا زمانہ ہی کوئی اندیشہ نہیں۔

کرایہ کی کوئی کوٹھی نہ ملنے کی وجہ سے ۷ بجے شام کے میں نے مہاراجہ بنارس کو ان کی کوٹھی کے لئے تار دیا۔ بارہ بجے شب کے سو رہا۔

۲- اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۲۷- شہریور ۱۳۲۲ ف
کرایہ کی موٹر منگا کر مہادیو پرشاد کی کوٹھی دیکھنے کے لئے رامچندر پرشاد کو لے کر گیا مگر وہ مجھے ناپسند ہوئی برخوردار عثمان پرشاد کا ٹمپریچر آج کسی قدر کم ہی۔ میں نے رامچندر پرشاد اپنے مصاحب اور امراؤ خزانچی کو راجہ دیوان کی کوٹھی دیکھنے کے لئے حکم دیا۔ وہ گئے اور خبر لائے کہ وہ کوٹھی کرایہ پر دے دی گئی ہی۔ اِس کے بعد مہاراجہ دربھنگہ کی کوٹھی کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ کوٹھی خالی ہی مگر میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اُن کو تار دوں۔ میں نے حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے ساتھ رامچندر پرشاد کو کوٹھیاں دیکھنے کے لئے بھیجا مگر ناکامی ہوئی۔ بارہ بجے دوپہر کے پھر ڈاکٹر زاہد حسین صاحب نے آکر بچّے کو دیکھا دو بجے کھتری سبھا کی ایک ممبر گوبر پرشاد آئے مگر میں نے ملاقات نہیں کی۔ ۴ بجے گنگا داس رامجی داس مہنت بڑے اکھاڑے والے آئے اُن کے جانے کے بعد چھوٹے اکھاڑے والے مہنت آئے ملاقات کی بڑے اکھاڑے والوں سے کوٹھی کے انتظام کے متعلق کہا مگر چوں کہ مہاراجہ بنارس کا

تار کوٹھی لینے کے لئے آچکا تھا اس لئے انکاری جواب دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوٹھی پہلے ہی سے رُکی ہوئی ہے۔ آج میرے ڈبوں میں بجلی بھری جا رہی ہے۔

آج میری رانیاں مع اپنے ہندو زنانہ اسٹاف کے گنگا جی کے اشنان کو گئیں۔ رام راؤ خزانچی اور ایک گارڈ راجہ پلٹن کا اُن کے ساتھ گیا۔

۳۔ اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۲۸۔ شہریور ۱۳۲۲ ف

الہ آباد میں میرا آنا زیادہ تر اکبر حسین صاحب اکبر پنشنر جج کی ملاقات کی غرض سے تھا لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں اُن کے جوان ہونہار فرزند نے انتقال کیا تھا جس کے صدمہ سے وہ سوگوار تھے۔

صبح کو چھوٹی حاضری سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب آئے حضرت موصوف کے ساتھ رامچندر پرشاد کو لے کر اکبر حسین صاحب کے مکان پر جا کر اُن سے ملاقات کی۔ نہایت زندہ دل آشنا پرست عارف باللہ اور ہر فن مولیٰ ہیں۔ بہت دیر تک لطفِ صحبت رہا۔ کلام اُن کا درد سے بھرا ہوا ہوتا ہے مضامین بلند، بندش چست صاحب دیوان ہیں۔ ۱۰ بجے کے قریب میں وہاں سے واپس ہوا۔ رامچندر پرشاد اور عبا ر صاحب کو کوٹھی کے انتظام کے لئے حکم دیا گیا وہ دونوں گئے اور بعد تلاش بسیار لالہ رام چرنداس صاحب کا رام باغ جو گنگا کے کنارے شہر سے کسی قدر فاصلہ پر ہے دیکھ آئے اور مجھے اطلاع دی۔ رام چرنداس صاحب کھتری یہاں کے سرآوردہ معززین سے ہیں۔ دولتمندی کے اعتبار سے بھی ممتاز ہیں۔ چار بجے خود رام چرنداس صاحب میرے پاس آئے ملاقات کی اور مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کی رام باغ والی کوٹھی دیکھنے چلوں

چنانچہ میں نے موٹر منگوائی اور ان کو ساتھ لے کر مع مصاحبوں کے رام باغ کی کوٹھی دیکھنے کے لئے گیا۔ موقع کے اعتبار سے تو وہ کوٹھی اِس قابل تھی کہ میں اس میں ایک ہفتہ قیام کروں لیکن دو وجہوں سے میں نے اُس کو پسند نہیں کیا۔ ایک یہ کہ شہر سے زیادہ فاصلے پر تھی اور مجھے برخوردار عثمان پرشاد کی نادرستیِ طبیعت کی وجہ سے بار بار ڈاکٹر کے بلانے کی ضرورت داعی ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اِس میں اس قدر گنجائش نہ تھی کہ میری زنانہ و مردانہ اسٹاف کے لئے کافی ہوسکے۔ وہاں سے واپس ہوکر بذریعہ ایک چٹھی کے لالہ رام چندر داس صاحب کی اخلاقی زحمت کا شکریہ ادا کیا اور وٹھل راؤ انگریزی محرر کو حکم دیا کہ جبلپور تک اسپشل کا فوراً انتظام کیا جائے اور ایک تار لالہ جیونداس گوکل چند سیٹھ جبلپور کو دیا کہ کرایہ کی کسی کوٹھی کا انتظام کریں۔ انگریزی محرر نے آکر رپورٹ کی کہ اسٹیشن ماسٹر ایک بجے شب تک اسپشل تیار کر دینے کا وعدہ کرتے ہیں ایک بجے شب کو مجھے اطلاع ملی کہ اِس وقت اسپشل کا انتظام نہیں ہوسکتا کل ممکن ہے۔ چوں کہ اسٹیشن پر ڈبوں میں مقیم ہوں اتنے طولانی سفر میں مجھے کبھی ایسی تکلیف نہیں ہوئی جیسی الٰہ آباد میں اسٹیشن پر ہوئی۔ ایک طرف تو برخوردار عثمان پرشاد کے ٹمپریچر بڑھنے کی فکر دوسری طرف میری دوسری لڑکی میر خورشید علی کی بیوی کو شدت سے بخار آگیا۔ ادھر ملازمین کا سفر کی تکلیف سے بیدل ہونا، ایک طرف کوٹھی کی طرف سے مایوسی، ڈبوں کے دونوں طرف صبح سے شام تک تیز دھوپ، اور بدبوسی دماغ کی درگت۔ بہرحال میں بارہ بجے اپنی فکروں میں اُلجھکر سوگیا۔

۴۔ اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۲۹۔ شہریور ۱۳۲۲ ف — صبح کو بیدار ہوکر اسپشل کے انتظام کا غبار صاحب کو حکم دیا چنانچہ وہ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ سے ملے اور حکم دیا نو بجے اسپشل تیار

ہوئی اور ہم یہاں سے جبلپور کو روانہ ہوئے۔ اثناء قیام الہ آباد میں جس قدر حصہ نظم کا دل و دماغ سے نکلا ضیافت طبع ناظرین کے لئے پیش ہے۔

غزل

کہتا ہے کون اس کو کہ وہ بے نمود ہے
ہے سب نمود اس کی وہی اک وجود ہے

روز الست حق نے یہ تعلیم دی مجھے
ہستی و بود میری عدم کی نمود ہے

دود جگر سے میرے ہی یہ آسماں بنا
روز ازل سے درد مرا یا ودود ہے

کیا جانے اس کو کوئی کہ یہ کس کی شان ہے
یہ رنگ چرخ کا جو ازل سے کبود ہے

عارف ہے گر تو چشم بصیرت سے دیکھ لے
ہر برگ اور ذرے میں اس کی نمود ہے

موجود ہو کے رہتا ہے آنکھوں سے وہ نہاں
عین الوجود پر وہ عدیم الوجود ہے

جام جہاں نما ہے کہ پہلو میں دل مرا
ہر ایک کے ضمیر کی پیچ پر کشود ہے

بازار دہر میں ہے مشیت کا انتظام
ناشاد کیوں ہو شاد زیاں ہے نہ سود ہے

دیگر

افشا ہوا یہ راز مری بے خبری سے
عالم کو تحیر ہے تری جلوہ گری سے

کیا گرمی و سردی سے زمانہ کی ہوں آگاہ
وہ لوگ جو واقف نہیں خشکی و تری سے

لا دینا ہمیں بھی خبر فصل بہاری
کہہ دینا ذرا گل یہ نسیم سحری سے

افسوس کہ دل اس کا پسیجا نہ کسی دن
دل ٹوٹ گیا نالوں کی اس بے اثری سے

میں تیرا ہی بندہ ہوں تجھی سے ہے مجھے کام
کیا مجھکو سروکار بھلا در بدری سے

مستوں سے ذرا پوچھ لے کیا اس میں اثر ہے
واقف نہیں زاہد تو ذرا بے خبری سے

ٹھکراتے ہوئے چلتے ہو عشاق کی تربت
محشر نہ بپا ہو کہیں اس فتنہ گری سے

بیخود ہوں مگر پھر بھی ہوں خود دار میں ای شادؔ
عالم ہے خبردار مری بے خبری سے

دیگر

لبریز جام دیکھ کے نیت بدل گئی
زاہد کا زہد رہ گیا ساقی کی چل گئی

ذکرِ خدا میں شیخ تھے مصروف رات دن
جلوہ جو مِس کا دیکھا تو نیت بدل گئی

دلسوز شمع کی طرح اس بزم میں ہے کون
پروانہ کے فراق میں خود آپ جل گئی

ناکامیاب رہنے کا افسوس کیوں نہ ہو
قابو میں اپنے آکے وہ میڈم نکل گئی

لکھی غزل غزل پہ یہ اکبرؔ کی رات کو
اپنی بھی اہلِ سیف سے تلوار چل گئی

ہے حسنِ بوستانِ فرنگ احسن الجمال
اے شادؔ کچھ تو اپنی طبیعت بدل گئی

دیگر بر غزل اکبرؔ

بطونِ جلوہ حسنِ ازل آرا کو کیا کہیئے
طریقت کا اشارہ ہے خدا کہیئے خدا کہیئے

قطعہ

خدا کہنے پہ کہتے ہیں نہیں پرماتما کہیئے
اگر پرماتما کہتا ہوں کہتے ہیں خدا کہیئے

مری وحدت پرستی پڑ گئی ای شادؔ ضغطے میں
نہیں کچھ کہتے بنتا ہے اگر کہیئے تو کیا کہیئے

ہماری بندگی بھی کم نہیں ہے کچھ خدائی سے
اسی کا گرچہ مظہر ہے مگر اس کو خدا کہیئے

سنایا ہی کئے ہم داستانِ دردِ دل اُن کو
وہ کہتے ہی رہے کیا کہہ رہے ہو مدعا کہیئے

ہی انساں دائرہ پرکار کا یا نقطۂ کثرت
اسی کو ابتدا کہیئے اسی کو انتہا کہیئے

جمالِ دوست نورِ احسن الخالق کا جلوہ ہی
بشر کے حسن کو بھی جلوہ حسنِ خدا کہیئے

ہی دردِ عشق کا جھگڑا جہاں میں جس طرف دیکھو
اسی کو داستاں کہیئے اسی کو ماجرا کہیئے

حقیقت میں مری ہستی ہے مظہر کنزِ مخفی کی
اسی کو عالم آرا کہیئے یا اس کو خدا کہیئے

خوشامد کرنے والوں کی یہی عادت ہی دنیا میں
برا بھی گر کہے حاکم تو اس کو بھی بجا کہیئے

قدیم و حادث اس کے علم و خلقت میں ہوئے ہم بھی
وہ اپنی ابتدا کہیئے یہ اپنی انتہا کہیئے

ہوا جیسا ایک ذرّہ جلوہ دارِ شانِ صحرائی
پھر اس قطرہ کو دریا کا نہ کیوں کر آشنا کہیئے

گرا کر پردۂ رسمِ پرستش دیر و کعبہ میں
کہا خود ہی کہ یاں تو رام کہیئے یاں خدا کہیئے

اسی کی ذات واحد کا ہی پرتو دونوں عالم میں
نہ کہیئے گر خدا اس کو تو کہیئے پھر کہ کیا کہیئے

اٹھا یا پردۂ اسرارِ وحدت عینِ کثرت میں
مری ہستی کو اب تو مظہرِ رازِ خدا کہیئے

ازل کی صبح کو کنزِ خفی کی داستاں کہیئے
ابد کی شام کو صبحِ ازل کا ماجرا کہیئے

بہت اے شادؔ ہوں میں کشمکشِ ناشادیِ دنیا
اگر سنیئے تو کیا سنیئے اگر کہیئے تو کیا کہیئے

ہماری اسپشل جس وقت ستنا اسٹیشن پر پہونچی تو جبلپور سے رائے بہادر جیونداس گوکل چند کا تار وصول ہوا کہ کوٹھی تیار ہی جبلپور سے دو تین اسٹیشن اُدھر واجپے شیو بالک منیجر جیونداس صاحب کی طرف سے استقبال کے لئے آئے ہیں اُن سے مل کر خوش ہوا۔ آدمی زیرک خوش طبع معاملہ فہم اور سنجیدہ ہیں ساڑھے آٹھ بجے شب کے ہماری اسپشل جبلپور پہونچی۔

جیونداس صاحب کی اخلاق اور تہذیب کی خوبیاں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ میں اُن کا اندازہ کرسکوں۔ نہایت ملنسار و منکسر خلیق زندہ دل ہیں۔ اسٹیشن پر موٹروں کا انتظام تھا۔ میں منیجر صاحب کے ساتھ کوٹھی دیکھنے کے لئے گیا۔ کوٹھی (گوبند بھون) ایک عالیشان اور اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھی جس کے دیکھنے اور پرفضا ہونے سے مسرّت ہوتی تھی۔ اپنے محلات اور تمام اسٹاف کو اس کوٹھی میں اُتارا گویا الہ آباد کی ناگفتہ بہ تکلیف کی تلافی ہوگئی۔ بارہ بجے آرام کے ساتھ میں سوگیا۔

۵۔ اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۳۰۔ شہریور ۱۳۲۲ف	ڈبوں سے تمام سامان منگوا کر ڈبّے خالی کرائے گئے۔ چوں کہ میری دوسری لڑکی یعنی میر خورشید علی دولہا

نواب کی بیوی کو شدّت سے بخار تھا اِدھر برخوردار عثمان پرشاد کا ٹمپریچر بھی اعتدال سے کسی قدر بڑھا ہُوا تھا جس سے میں بیحد پریشان تھا، ڈاکٹر لالے ویندراس صاحب کو بلوا کر دکھایا گیا اور ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ سے ایک نرس کو وہاں مقرّرہ فیس پر مقرّر کیا گیا کہ تا مریضہ کی نگرانی کرے۔

شام کے ½ ۵ بجے میرے معزز میزبان رائے بہادر جیونداس اور اُن کے فرزند گوبنداس میری ملاقات کو آئے میں اُن سے مل کر نہایت محظوظ ہوا۔ ۸ بجے شب کے الہ آباد سے میری تیسری لڑکی جس کی آخر ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ میں لالہ مہرچند لاہوری عرف سیٹھ فتو کے فرزند اقبال چند سے شادی ہوئی تھی اور لاہور سے کشمیر کو اپنی سسرال گئی تھی (جس کی روانگی کا حال قیام لاہور کی تاریخوں میں آچکا ہے)

اُن کے واپس ہونے کا تار آیا۔ اسٹیشن پر صبح کو گاڑیاں بھیج دینے کا انتظام کیا گیا۔

۲۔ اگست ۱۹۱۳ء (مطابق) ۱۳۔ شہریور ۱۳۲۲ ف آج صبح کی ٹرین میں میرے سمدھی فتّو سیٹھ لالہ مہرچند اور میرا داماد لالہ اقبال چند (دو لھا راجہ) مع اپنی بیوی کے کشمیر سے آئے آج میں نے وٹھل راؤ انگریزی کلرک کو حکم دیا کہ بمبئی سے ایک سیلون اور فرسٹ و سکنڈ کلاس وغیرہ ڈبوں کے منگوانے کا انتظام کیا جائے۔ دن بھر میں کہیں نہیں گیا۔

آج بابا مست رام سے ملاقات ہوئی جو ایک آزاد منش سالک مجذوب اور مذہبی علوم کے ماہر درویش ہیں اور میرے معزز میزبان سیٹھ جیون داس صاحب کی کوٹھی ہی میں رہتے ہیں۔ یہ بالکل بے لوث اور تارک الدّنیا ہیں۔ ابتدا میں ان کی قوّتِ جاذبہ سلوک پر بہت غالب تھی اب وہ بات تو نہیں ہے لیکن فقیرانہ جذب کی گرمی کا اثر اب بھی اُن کو گرمائے رہتا ہے خصوصیت کے ساتھ کسی ایک مقام پر نہیں رہتے دو دِن کہیں چار دِن کہیں جنگلوں میں نکل جاتے ہیں تو ایک ایک ہفتہ وہیں رہتے ہیں۔ جو کچھ جہاں سے ان کو ملتا ہے فوراً مندروں اور مختلف مقاموں میں جاکر غریب فقرا کے کھانے کپڑے سے خبر لیتے رہتے ہیں کسی سے سوال کرنے کی عادت نہیں فقرا میں میں نے ان کو نہایت بے طمع پایا۔

شام کو ۵ بجے موٹر میں بمعیت غبار صاحب اور رامچندر پرشاد و منیجر صاحب انگریزی بارگوں کی طرف گیا۔ دیرہ دون کے مناظر سے یہاں کے اِس منظر کو ترجیح نہ دینے میں مجھے اپنی کوتہ نظری کے اقرار پر مجبور ہونا پڑے گا۔ میں نے اپنے اِس سفر میں دیرہ دون

ہردوار وغیرہ میں بہت سی دل لبھانے والی سینیریاں دیکھیں اکثر ایسے دلچسپ مناظر میری نظر سے گذرے جن کو دیکھکر چمنستانِ کُن کی نظر فریب گلکاریوں پر بے اختیار سبحان اللہ زبان سے نکل گیا۔ مگر اس منظر کی شان ہی اور ہی بات یہ ہے کہ جس چیز کی آبیاری قدرت کرتی ہی اور جس چہرہ میں نیچر کی مشاطہ کا سحر آفریں ہاتھ لگجاتا ہے اُس کے جذبات اِس درجہ بڑھجاتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے دل یک بیک ہاتھ سے نکلجاتا ہی۔ دُنیا ہر پہلو سے اس امر کا تجربہ کرا رہی ہی کہ انسانی تکلفات اپنی صناعیوں سے چاہی جس قدر کرشمے دکھائیں مگر قدرت کی ایک ادنیٰ سی کاریگری اپنی سادگی کا تماشا دکھاکر سارے کرشموں کو خاک میں ملا دیتی ہی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے خالقیت و مخلوقیت کا نازک اور واجب التسلیم مسئلہ ثابت کیا جاتا ہی ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

شام کا وقت ہی ڈوبتے ہوئے آفتاب نے پہاڑ کے مغربی حصّے کی ہر چیز کو اپنی سنہری کرنوں کے عکس کے آتشی رنگ میں رنگ کر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہی سڑک کے دونوں طرف خود رو درختوں اور لہلہاتے ہوئے سبزہ نے پہاڑ کو اپنی آغوش میں لے کر اس وقت کی سینیری میں ایک خوشگوار تازگی اور دلچسپ کیفیت پیدا کر دی ہی۔ پہاڑ کے اوپر فوجی بارگیں بنی ہوئی ہیں۔ میں اس پہاڑ کے آخری حصّے تک گیا۔ چوں کہ آج ہی شب کو میرے سمدھی فتو سیٹھ کشمیر کو واپس جانے والے تھے اس لئے میں اپنی ہوا خوری کی دلچسپی کو نا تمام چھوڑ کر واپس آگیا۔ اور سیٹھ صاحب کو روانہ کیا۔

۸ بجے شب کے دیوان بہادر رائے بلب داس کی چھٹی آئی جس میں اُنھوں نے میری ملاقات کی خواہش کی تھی جس کا جواب اُسی وقت دیا گیا کہ میں دوسرے روز دو بجے کے بعد اُن سے ملاقات کرسکوں گا۔

میری لڑکی کا ٹمپریچر آج کی شب ۱۰۴ کے قریب تھا جس کی وجہ سے مجھے سخت پریشانی تھی۔ اِسی پریشانی میں بارہ بجے میں سوگیا۔

۷۔ اگست ۱۹۱۳ء مطابق یکم۔ مہر ۱۳۲۲ ف	۶½ بجے بیدار ہوکر معمولی کاموں سے فراغت پائی آج میں نے اپنی بڑی مہارانی اور رانی صاحبہ قبلہ کو مع میر خورشید علی کی

بیوی کے جو بخار سے علیل تھی اور جس کی نسبت ڈاکٹروں نے رائے قایم کی تھی کہ تپ محرقہ ہے بلدہ کو روانہ کردیا۔ ان کے ساتھ میر خورشید علی کی سالی (اپنی چوتھی لڑکی اور اقبال حیدر کی بیوی) کو بھی کردیا۔ صرف عثمان پرشاد اور اُن کی والدہ اور باقی بیگمات اور اُن کے بچوں کو یہیں رکھ لیا۔ وٹھل راؤ کو ڈبوں کے انتظام کا حکم دیا۔ ۳ بجے دیوان بہادر رائے بلب داس مع فرزند اور دو مصاحبوں کے میری ملاقات کو آئے۔ میں اُن سے مل کر نہایت محظوظ ہوا اور دیر تک لطفِ صحبت رہا مجھ سے اُنھوں نے وعدہ لیا کہ میں ان کے گلاس فیکٹری کو دیکھوں چنانچہ میں نے کل چلنے کا وعدہ کیا۔ نہایت سنجیدہ دانشمند اور باوضع آدمی ہیں اِن کے جانے کے بعد میں خود اسٹیشن پر گیا۔ ڈبوں کا انتظام ہوچکا تھا۔ سب کو سوار کرکے سات بجے واپس ہوا۔

۸۔ اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۲۔ مہر ۱۳۲۲ ف	اوّل وقت تاروں اور خطوط کے جوابات ادا کیے۔ وٹھل راؤ انگلش کلرک کو بصیغہ ضروری ڈبوں کے انتظام کا حکم دیا۔

۲½ بجے دیوان بہادر رائے بلّب داس آئے اور میں مع غبار صاحب اور دیوان بہادر موصوف کے گلاس فیکٹری دیکھنے کے لئے گیا اس کے قبل بلوریں اشیاء بنتے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ میں نے نہایت دلچسپی کی نظر سے گلاس و صراحی وغیرہ بنتے دیکھیں۔ اگرچہ فنشنگ اس کام کی ولایتی کے مقابل میں کسی قدر گھٹی ہوئی ہے، مگر آفریں ہے رائے بلّب داس کی ہمّت اور شوق پر کہ اُنھوں نے اِس کارخانے کو قائم کر کے ثابت کر دیا کہ ہمارے ملک کے لوگ بھی ہنر کی قدر کرتے ہیں اور دل سے اس کا ذوق رکھتے ہیں۔ کارخانہ کے ہر حصّے کو تفصیلی نظر سے دیکھکر کام کرنے والوں کو دوسو روپیہ انعام دے کر کوٹھی کو واپس ہوکر بمبئی سے آئے ہوئے ڈبوں کو دیکھنے کے لئے اسٹیشن پر گیا۔

۹-اگست ۱۹۱۳ء (مطابق) **۳-مہر ۱۳۲۲ف** چوں کہ آج مجھے یہاں سے بسوئے حیدرآباد روانہ ہونا تھا اِس لئے معمولی مُلاقاتوں اور ضروری کاموں کے سوا کوئی نیا کام نہیں ہُوا۔ مست رام جی بابا سے آج پھر ملاقات ہوئی۔ ہر رنگ کے کھلے ہوئے پھُول مجھے دیئے۔ ایک پونڈ اُن کی نذر کیا گیا جس کو لے کر وہ فوراً بازار گئے اور ایک تھان چھلواری کا لے کر کسی مندر میں گئے اور وہاں غریب سادھوؤں کو تقسیم کر کے پھر میرے پاس آئے اور مجھے رخصت کر کے خدا حافظ کہکر چلے گئے۔

۷ بجے شام کے تمام سامان اسٹیشن پر پہونچ گیا۔ ۸ بجے تک زنانہ و مردانہ اسٹاف اپنے اپنے ڈبوں میں بیٹھ گیا۔ اسٹیشن پر دیوان بہادر رائے بلّب داس اور اُن کی فرزند

اور نیز دیگر احباب مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے آئے ہوتے تھے۔ ۱۱ بجے شب کے میں جبلپور سے حیدرآباد کو روانہ ہوا۔

۱۰- اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۴- مہر ۱۳۲۲ف	سے ۷ مہر یا ۶ رمضان المبارک سے ۹ رمضان المبارک تک راستے میں سوا معمولی توقفوں

کے میں نے کہیں قیام نہیں کیا۔

۱۳- اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۷- مہر ۱۳۲۲ف	۹- رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ چہار شنبہ کو ۱۲½ بجے بفضلہ تعالیٰ شانہٗ حیدرآباد اسٹیشن پر دو مہینے کے

بعد میرا سفر ختم ہوا۔